Registered No. L. 5340

جلد ۳۶ رمضان - ۱۳۶۷ھ

عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

قیمت سالانہ پانچ روپے

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اِس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ــــ محصُولڈاک ۲ر خرچ وی پی ۳ر

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journ[illegible]lies of India have highly spoken of this little boo[illegible]ny just now. Price Rs. 3/8.

فہرست مضامین

جلد ۳۱	رمضان ۱۳۶۷ھ مطابق جولائی ۱۹۴۸ء	عدد ۳

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے گیلور آرٹ پریس ایبٹ روڈ لاہور میں چھپوا کر

دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

پچھلے مہینے ان صفحات میں ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کا جو جائزہ لیا گیا تھا وہ اس کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے مُلک کی حالیہ سرگزشتِ خونیں پر ایک نگاہ ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل کر اپنی خود غرضی، تنگ دلی اور احمقانہ بے تدبیری سے اس کو کس خوفناک تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر آئی ہے — یعنی مسلم قوم —— وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگریس کو برسرِ اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے کا پروگرام سُن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس مُلک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ اُن کے لئے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر آچکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے، سب تمہارا وہم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈراوا ہے، جو سیلاب

اُٹھ رہا ہے ٹھیک اُٹھ رہا ہے: اطمینان کے ساتھ اس میں کود پڑو، اور جدھر وہ بہا کر لے جانا چاہتا ہے پورے انشراح صدر کے ساتھ ادھر بہ جاؤ۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ خطرہ واقعی اور حقیقی ہے، یہ سیلاب محض آزادیٔ وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو امپیریلزم کا سیلاب ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کے معنی قومی خودکشی کے ہیں، اور اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ پہلا گروہ اگرچہ بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں اور آزمودہ کار سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھا لیکن چونکہ وہ ایسی بات کہہ رہا تھا جو مسلمانوں کے عام احساسات کے خلاف تھی، اور پوری قوم کو ہندوستان کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کے ہاتھوں اس کے بالکل برعکس تجربات پیش آ رہے تھے، اس لئے مسلمانوں نے مجموعی طور پر اس کو رد کر دیا۔ اور جوق در جوق دوسرے گروہ کی آواز پر وہ لبیک کہتے چلے گئے۔

پھر دوسرے گروہ میں بھی جلدی ہی اس مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا کہ ہندو امپیریلزم کی اس بڑھتی ہوئی رو کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے راہ عمل کیا ہے۔

ایک رائے یہ تھی کہ مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔ اصولاً اس لئے غلط ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ اصول اُن اسلامی اصولوں سے ٹکراتے ہیں جن پر ہم ایمان لانے کے مدعی ہیں۔ اور عملاً یہ راہ اس بنا پر غیر مفید ہی نہیں، قطعی مہلک ہے کہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصے کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں مسلمان قلیل التعداد ہیں، اور ایک جمہوری نظام میں قومی جنگ لڑ کر اقلیت بجز تباہی کے اور کچھ مول نہیں لے سکتی۔ اس رائے کے پیش کرنے والوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر تم محض ایک قوم ہوتے تو بلا شبہ تمہارے لئے یہاں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ قومی جنگ لڑ کر اپنے جتنے حصے کو بچا سکتے بچا لیتے اور باقی حصوں کی طرف سے تنگی فاتحہ پڑھ لیتے۔ لیکن تم محض عام معنی میں ایک قوم نہیں ہو بلکہ ایک اصولی جماعت ہو جس کے پاس اصول اسلام کا

ہتھیار وہ زبردست ہتھیار ہے جو پہلے بھی دنیا کو مسخر کر چکا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ مایوسانہ نقشہ جنگ بناؤ۔ تمہارے لئے صحیح راہ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے لڑنے والی ایک قلیل التعداد قوم کی یہ پوزیشن چھوڑ دو جو غلطی سے تم نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مسائل زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام موجود الوقت نظاموں سے زیادہ جامع اور منصفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ اس چیز کو لے کر اگر تم اٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے علمی و فکری حیثیت سے اصول اسلام کا تفوق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو یقین جانو کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازن قوت بدل جائیگا۔ ہندوستان کی سیادت تمہارے سوا پھر کسی اور کا حصہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لئے پریشان ہو تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائیگی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لیکر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیر نگیں ہو جائینگے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، یعنی اگر ہم اس راہ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہیگا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ رائے قومی طرز عمل نہ بن سکی۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اُٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سارے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنا دینا صحیح نہیں ہے،

ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندؤں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی اصلاح وانضباط کا کوئی سوال۔ بظاہر بات بھی بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے جس قسم کی تعلیم وتربیت مل رہی تھی اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر بھی تھی، اس لئے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس رائے کو اپنا لیا۔ اس مرکزی تخیل پر جمع ہونے کے بعد سے جو کچھ مسلمانوں نے من حیث القوم کیا ہے اس تحریک اور اس قیادت کے زیر اثر کیا ہے جو اس تخیل کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی، لہٰذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور ہمارے آج کے حال کا حسن و قبح لازماً اس تحریک ہی کی طرف راجع ہوگا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام ونسب کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شامل ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی وکتاب اور دین وشریعت کو مانتا ہے یا نہیں، حرام وحلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور فجور وتقویٰ، دینداری وبے دینی کی مختلف صفات میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لئے تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بنانا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی فتوے اور امامت کا نہ تھا کہ دین واعتقاد کے تجسس کی ضرورت پیش آتی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لئے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت ورہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیسا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی۔ اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی

زیادہ مہارت دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت، امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا، بعینہٖ اسی قسم کی تحریک ایسے ہی کارکنوں اور لیڈروں اور پیروؤں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اٹھا سکتی تھی، لیکن اتفاق کی بات تھی کہ جو قوم اپنی مدافعت کے لئے یہ تحریک لے کر اٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا، اس لئے اسلام کی خدمات بھی اس کے لئے حاصل کی گئیں۔ اصول یہ قرار پایا کہ ہدایت و رہنمائی تو اسلام کے بس کا روگ نہیں ہے، اور نہ یہ کہنے کا اسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے، البتہ یہ اس کا فرض اور اولین فرض ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی امید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لئے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار دے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنم کا راستہ دکھائے، اس لئے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر قوم کا بچنا موقوف ہے، اور قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحب آخر رہینگے کہاں! یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جاں نثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آؤ اور حق نمک ادا کرو۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحب زادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ارے نا قدر خود ناشناس، تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا بلکا تھا

وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابل اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لئے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لئے فریق جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لئے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اس سے استصواب کریں۔

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جائے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے، اور جو کچھ وہ اپنی قومی خودغرضیوں کی خاطر کرتا گیا، مسلمانوں نے اس دلیل پر کہ اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شاید اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجئے جو وہ قوم کو بچانے کے لئے کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بنے جن کی حیثیت ہندو ریاست کی سرحدوں پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں

پر ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان نہ حالت امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالت جنگ میں یہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

اول روز ہی سے معلوم تھا کہ ہندو اس مطالبہ کی سخت مزاحمت کریگا، چنانچہ اس نے کی اور ایک طرف سے مطالبے اور دوسری طرف سے مزاحمت نے قومی جنگ کو اتنی شدید تلخی کی حد تک پہنچا دیا کہ شاید آج جرمنی اور روس، امریکہ اور جاپان، عرب اور یہود کے درمیان بھی اس سے زیادہ تلخی نہ ہوگی۔ اس قومی جنگ میں لامحالہ مسلمان ہی سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے تھے۔ کیونکہ ان کا پورا نصف حصّہ ہمارے اپنے مطالبہ کی رو سے ان کے مالکانہ تصرف میں جانے والا تھا۔ پھر چونکہ اقلیت کے مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں شریک کیا گیا تھا، بلکہ پیش پیش وہی تھے، اس لئے یہ یقینی بات تھی کہ جنگ کے آخری مرحلوں میں، اور تقسیم کے بعد ان کو بدترین مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑیگا۔ یوپی، بہار اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں کسی مکان پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ایک وقت میں یہی فقرے بدمست دشمنوں کو آتش زنی، قتل و غارت اور عصمت دری کی دعوت دیں۔

اس کے ساتھ مزید غضب یہ کہ قومی جنگ کے لئے ہم نے جو طاقت فراہم کی تھی وہ نعرے، جھنڈے، جلسے، جلوس، ریزولیوشن، اخباری بیانات اور سیاسی گفت و شنید سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یہ سب ہتھیار صرف اسی حالت کے لئے موزوں ہو سکتے تھے جبکہ قسمتوں کی میزان ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خود اپنی مصلحتوں کی خاطر توازن قائم کرنے کے لئے ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کے شور و غل کو وزن دینا چاہے۔ ہمارے لیڈر مدتوں تک اس حالت میں رہتے رہتے اس کے اتنے خوگر ہو چکے تھے وہ سب کچھ اسی کے اندر سوچ سکتے تھے۔ اس کے گذر جانے کے بعد دوسری حالت میں کیا کچھ درکار ہے، اس کا شاید انھیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے حالات یکایک پیش آگئے تو ان کا مقابلہ

کرنے کے لئے وہ بالکل بے سروسامان تھے۔

پچھلے سال کے آغاز تک کسی کو بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے اندر کیا کمزوریاں لئے ہوئے ہیں، ہماری سیاست کیا نتائج اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، اور قومی جنگ کس رُخ پر جا رہی ہے۔ شور و شغب اور ہنگامہ جوش نے ایک ایسا فریبِ قوت پیدا کر دیا تھا کہ ہم اپنی تنظیم کو ایک مکمل تنظیم اور اپنی سیاست کو ایک ماہرانہ سیاست سمجھے بیٹھے تھے، اور اس وقت ہر وہ شخص ہمیں اپنا دشمن نظر آرہا تھا جو سطح کے نیچے چھپے ہوئے کمزور پہلوؤں کی طرف، یا سر پر آئے ہوئے طوفانِ بلا کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کر دے۔ مگر جونہی کہ تقسیم کا فیصلہ ہوا، یکایک وہ ساری ہی کمزوریاں رنگ لے آئیں جو ہمارے قومی اخلاق میں، ہماری قومی تنظیم میں اور ہمارے سیاسی نقشے میں موجود تھیں۔

پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لئے اٹھی تھی اس کی تدبیر مدافعت کا خلاصہ یہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لئے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جا سکتا تھا۔

مشرقی پنجاب، دہلی اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ یکایک ٹوٹ پڑا تو وہ قومی تنظیم جس پر کئی سال سے مسلمان اعتماد کئے ہوئے تھے ان کیلئے بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ ہر جگہ کے مقامی لیڈروں اور قومی کارکنوں میں سے ۹۵ فیصدی سخت ناقابلِ اعتماد نکلے۔ انھوں نے عین وقت پر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور صرف اپنے بچاؤ کی فکر کی۔ ان محافظینِ قوم نے وہ اسلحہ تک، جو مسلمانوں کی مدافعت کے لئے فراہم کئے گئے تھے، زیادہ داموں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کرنے میں تامل نہ کیا۔ انہوں نے خطرے کے علاقوں سے مسلمانوں کو بچا کر نکالنے کے بجائے اپنے جانوروں اور اپنے عیش کے سامانوں کو نکال لانا زیادہ ضروری سمجھا۔

انہوں نے پاکستان کے سرکاری ٹرکوں پر پناہ گزینوں کو بٹھانے کے لئے بھی رشوتیں وصول کیں۔ انہوں نے کیمپوں میں ایک ایک دانے کے لئے ترسنے والے پناہ گزینوں کے ہاتھ بھی وہ روٹیاں مہنگے داموں بیچیں جو سرکاری خرچ پر بھیجی گئی تھیں۔

پھر مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تعمیر سے جو غفلت برتی گئی تھی اس نے اپنے بدترین نتائج پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف دکھائے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے بڑے بڑے علاقے محض دھمکیوں میں خالی کردئے، انہوں نے انتہائی بے غیرتی کے منظر جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ایک ایک سکھ کے آگے پچاس پچاس مسلمان زمین بوس ہوئے، اور اس کے ساتھ عین اس قیامت صغریٰ کی حالت میں بھی مسلمان نے مسلمان کو لوٹنے میں، اور ذرا ذراسی ضرورت کی چیزیں اپنے مصیبت کے ساتھیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کے داموں بیچنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ دوسری طرف مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں نے، ان کے لیڈروں اور قومی کارکنوں نے، ان کے منتخب کئے ہوئے ایم ایل اے صاحبان نے اور ان سرکاری ملازموں نے جو کبھی قومی درد سے بہت تڑپا کرتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے مال لوٹ لوٹ کر جس طرح اپنے گھر بھرے، اپنے پناہ گزیں بھائیوں کے بسنے میں جو مشکلات پیدا کیں، مصیبت کے مارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا، اور پاکستان بنتے ہی بے نظمی، نافرض شناسی، رشوت، خیانت، اقرباپروری اور ظلم و بے انصافی کی جو گرم بازاری کی اسے دیکھ کر یہ بالکل عیاں ہوگیا کہ سیرت و اخلاق کے بغیر نرے جھنڈوں، نعروں اور جلوسوں کے بل پر کسی قوم کو اٹھانے کے کیا نتائج ہوا کرتے ہیں۔

اس سارے نامۂ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچالیا اور ان کی ایک قلمی ریاست بنوادی لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بری طرح ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک

مجوزہ تھا۔ سرحدات کا تعین گفت و شنید سے طے کرنے کے بجائے دو کمیشنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی ترکیب ایسی قبول کی گئی جس سے فیصلہ کا اختیار کلیتہً صدر کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ صدر بھی کسی غیر جانبدار قوم کا آدمی نہیں بنایا گیا بلکہ انگریز قوم سے لیا گیا جو ہندوستان میں نہ غیر جانبدار تھی نہ بے غرض۔ پھر اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے اختیارات بھی اس شخص کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے جو صرف ہندوستان کا گورنر جنرل رہ جانے والا تھا، اور ہماری قیادت عظمیٰ نے پیشگی یہ قول دے دیا کہ اس فیصلے کی رو سے جو سرحدیں مقرر کی جائینگی انہیں وہ بے چون وچرا مان لیگی۔ اس شدید غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمان اکثریت کے متعدد علاقے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیے گئے۔ مشرقی پنجاب کی پوری نو تحصیلیں، جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ گورداسپور کا ضلع ہندوستان میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے ہندو رئیس کو ہندوستان کے ساتھ تعلق جوڑنے کا راستہ مل گیا۔

انتقالِ اختیارات کی جو صورت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کی تھی وہ صریح طور پر پاکستان کے حق میں سخت مضر تھی، مگر ہماری قیادت عظمیٰ نے اسے بھی جوں کا توں قبول کر لیا۔ پاکستان کے حصہ کی فوجیں جگہ جگہ منتشر تھیں، اس کے حصے کا سامان اور فوجی ذخائر بھی ہندوستان کے قبضے میں تھے، اس کے حصے کا سرمایہ بھی ہندوستان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کے دفاتر اور اس کا عملہ تک ابھی پوری طرح منتقل نہ ہوا تھا، اور اس حالت میں پاکستان کی مستقل مملکت نظم و نسق اور دفاع کی پوری ذمہ داری کے ساتھ قائم کر دی گئی۔ آج یہ اسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے جس آدھے حصے کو انھوں نے ہندو اقتدار کے جنگل سے نکالا ہے وہ بھی اس کے دباؤ سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ جوناگڈھ پر انہوں نے زبردستی قبضہ کیا اور ہم اپنی بے لبسی کی وجہ سے انگلی تک نہ ہلا سکے۔ کشمیر کے مسلمانوں کو وہ ہمارے سامنے پامال کر رہے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ میں کھُل کر لڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ہماری گنّی ان سے دبی ہوئی ہے اور ہم ہر موقع پر ان سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔

آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری

بربادی کے کیا سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم کو اور ساری دنیا کو اس شرارت کی اطلاع دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے گئے جو مسلمانوں کیلئے سخت تباہ کن تھا؟ کیوں آپ نے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماونٹ بیٹن اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہے اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہیں؟ صرف یہی نہیں کہ اُس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرز تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہوگئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں، دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو امپیریلزم کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ اسلام کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالہ کر دیئے جو ان کے قومی مسئلے کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو امٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟

مقالات

اسلام اور اُس کے تقاضے

یہ وہ تقریر ہے جو ۱۵ر فروری ۴۸ء کو خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کی گئی تھی۔ اگرچہ اس میں روئے سخن مسلمان عورت کی طرف ہے اور اس کو اس کے فرائض اور حقوق سے آگاہ کیا گیا ہے، لیکن اسلام اور اُس کے تقاضوں کی جو تشریح اس میں کی گئی ہے وہ سب کے لئے عام ہے۔

تعریف اُس خُدا کے لئے ہے جو ساری کائنات کا اور اُس کے رہنے والوں کا خالق، مالک، رازق، مربی، آقا اور نگہبان ہے۔ جس نے انسان کو عقل عطا کی۔ صحیح اور غلط کی سمجھ دی، بھلے اور بُرے کی تمیز بخشی، سوچنے سمجھنے اور زندگی کے رستے کو پہچاننے کی قابلیت عطا کی اور انسان کی رہنمائی کے لئے اپنی کتابیں نازل کیں اور اپنے رسول بھیجے اور درود و سلام ہو اللہ کے ان نیک بندوں پر جنھوں نے انسان کو زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ بتایا۔ اُسے پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دی، اور دنیا میں انسان بن کر رہنے کا طریقہ سکھایا۔

ماؤ! بہنو! بیٹیو! آج اس دنیا میں کروڑوں انسان ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ مگر جس دنیا کو ہم "دنیائے اسلام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اُس کا حال بالکل ایک چڑیا گھر کا سا ہے۔ جس طرح چڑیا گھر میں رنگ رنگ کا جانور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والا موجود ہوتا ہے، اور مختلف قسم کے جانوروں میں کوئی چیز اس کے سوا مشترک نہیں ہوتی کہ سب ایک چڑیا گھر میں رہتے ہیں، تقریباً ایسا ہی حال مسلمانوں کی دنیا کا بھی ہے کہ اس میں طرح طرح کے آدمی جمع ہیں۔ اور اُن کے درمیان بجز نام کے کوئی چیز بھی مشترک نہیں رہی ہے

اُن میں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں خدا کے وجود میں شک ہے۔ ایسے بھی ہیں جن کو وحی و رسالت میں شُبہ ہے۔ ایسے بھی ہیں جو آخرت کے منکر ہیں اور یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کی عدالت میں کبھی اس زندگی کا حساب بھی پیش کرنا ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بھلائی اور بُرائی کی اُس تمیز سے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے انکار کرتے ہیں اور جانوروں کی طرح غافل زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی نگاہ میں اسلام کا سکھایا ہوا طریقِ زندگی صحیح نہیں ہے اور جنھوں نے دنیا کے دوسرے طریقوں میں سے اپنی خواہشات کے مطابق کوئی طریقہ پسند کر رکھا ہے ——— اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ سب لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان کہلائے جانے پر مُصر ہیں اور وہ تمام حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی سوسائٹی میں ایک مسلمان ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مجموعہ میں بہت کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو فی الواقع اس معنی میں مسلمان ہوں جس معنی میں اسلام کسی شخص کو مسلمان کہتا ہے۔

آخر یہ صورت حال کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہماری مسلمان دنیا زیادہ تر نسلی مسلمانوں پر مشتمل ہے جو صرف اس وجہ سے مسلمان ہیں کہ اُن کے باپ دادا مسلمان تھے اور اتفاق سے یہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ اگر سنجیدگی سے سوچیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائیگی کہ انسان کو پیدائش سے نسب مل سکتا ہے، نسلیت مل سکتی ہے، وطنیت مل سکتی ہے، لیکن کسی شخص کو محض پیدائش سے اسلام نہیں مل سکتا۔ آدمی پیدائشی طور پر جاٹ ہو سکتا ہے، راجپوت ہو سکتا ہے، ہندوستانی ہو سکتا ہے، انگریز اور جرمن ہو سکتا ہے، لیکن ماں کے پیٹ اور باپ کے نطفے سے آدمی کو دین نہیں مل سکتا۔ دین تو صرف اِس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ آدمی جان بوجھ کر اُسے پسند کرے اور اپنے ارادہ سے اس کو اختیار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ نسلی مسلمان ہیں اور محض باپ دادا کے گھر سے انھیں اسلام کی نسبت حاصل ہو گئی ہے، ان کے پاس مسلمانوں کے سے نام تو ہیں، لیکن وہ صفت ان میں مفقود ہے جس کا نام اسلام ہے۔ ان کے سامنے وہ طریقِ زندگی ہے ہی نہیں جو اسلام نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انھوں نے نہ کبھی اُسے جاننے کی کوشش کی۔ نہ اُسے اپنے

لئے پسند کیا، اور نہ اس پر چلنے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ اسلام کی جو حقیقت ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے کہ :۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ	ایمان کا مزا اس شخص نے چکھ لیا جو راضی ہوگیا اس
ربًّا وبمحمدٍ رسولًا وبالاسلام دینًا	پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو اور محمدؐ ہی اُس کے رسول
	ہوں اور اسلام ہی اس کا طریق زندگی ہو

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے سوچ سمجھ کر برضا و رغبت اسلام قبول نہیں کیا وہ اسلام اور ایمان کے مزے سے نا آشنا ہے۔ اس نے دین کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔

مسلمان ہونے کے معنی مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ دنیا میں خدائی۔ پروردگاری، اور آقائی کے جتنے مدعی پائے جاتے ہیں ان سب میں سے صرف ایک ربّ العالمین ہی کی بندگی اُسے کرنی ہے۔ جن جن ہستیوں اور طاقتوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آدمی اُن کی مرضی کی پیروی کرے اور اُن کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی شخصیت کو اُن کے حوالے کر دے، ان سب میں سے صرف ایک اللہ ہی کی ہستی ایسی ہے جس کے آگے اُسے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے اور وہی ہے جس کی مرضی اُسے ڈھونڈنی ہے پھر مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں کے درمیان آدمی یہ فیصلہ کرے کہ اُسے وہی ایک طریقِ زندگی پسند ہے جس کو اسلام نے پیش کیا ہے۔ دوسرے طریقوں کو ترجیح دینا تو درکنار ان کی طرف کوئی رغبت اور لگاوٹ بھی اُس کے دل میں نہ ہو۔ اس کو دل سے اسلام ہی کا طریقہ مرغوب اور پسندیدہ ہو۔ پھر مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں انسان کی رہنمائی و رہبری کے جتنے مدعی گزرے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں ان سب کے درمیان ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو وہ اپنی رہنمائی کے لئے چن لے اور فیصلہ کرلے کہ اُسے بس آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے۔

اس طرح جب کوئی شخص اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما تسلیم کر لے تب کہیں وہ مسلمان ہوتا ہے۔ اور جس نے اس طرح اسلام قبول کیا ہو اس کا کام یہ ہے کہ اپنی خواہشات

کو اللہ کی مرضی اور اسلام کے قانون اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تابع کر دے پھر اس کے لئے چون وچرا کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ پھر اسے یہ کہنے کا حق نہیں رہتا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں یہ حکم دیا ہے اور اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ رہنمائی کی ہے اور اگرچہ قرآن اس بارے میں یہ فیصلہ دیتا ہے اگر میری رائے اس سے متفق نہیں ہے اور میں چلوں گا اپنی ہی رائے پر، یا دنیا کا چلتا ہوا طریقہ اس کے خلاف ہے اور مجھے پیروی اسی طریقہ کی کرنی ہے جو دنیا میں چل رہا ہو۔ یہ رویہ جس شخص کا ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ حقیقت میں ایمان لایا ہی نہیں ہے۔ حقیقی ایمان لانا تو یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند اور ناپسند کو، اپنی خواہشات اور جذبات کو، اپنے خیالات اور نظریات کو پوری طرح اسلام کے تحت کر دے اور ہر اس غیر اسلامی طریقے کو رد کر دے جو دنیا میں رائج و مقبول ہو یا جس کی طرف نفس کا شیطان رغبت دلائے۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلعم یوں بیان فرماتے ہیں کہ:-

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ	تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جسے لیکر میں آیا ہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک آدمی کے نفس کا شیطان خدا کے حکم کے آگے ڈھیلا نہ دے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دے اس وقت تک آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک کسی شخص کے نفس کا یہ دعویٰ قائم ہے کہ زندگی میں میری خواہش کی اطاعت ہونی چاہیئے، اس وقت تک اس کے دل میں ایمان و اسلام نہیں ہے۔ ایمان و اسلام یہ ہے کہ آدمی کا دل کہنے لگے کہ میں بے چون و چرا دین کی اطاعت پر راضی ہوں۔

ذمہ دارانہ زندگی

پھر اسلامی زندگی کے معنی یہ ہیں کہ آدمی میں ذمہ داری کا احساس ہو۔ مومن کی زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی ہوتی ہے۔ جب دل میں ایمان موجود ہو وہ کبھی اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنی زندگی کے سارے اعمال کے لئے، خیالات کے لئے، اقوال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ اس کو مرنے کے بعد یہ حساب دینا ہے کہ دنیا

میں اس نے کیا کیا، کیا کہا اور سُنا، کن طریقوں سے زندگی بسر کی، کن مشاغل میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کیں، کن ذرائع سے کمایا اور کن راہوں میں اپنے مال کو صرف کیا اور کن مقاصد کے لئے دنیا میں سعی و کوشش کی۔ مومن کبھی اس خیالِ خام میں مبتلا نہیں ہوتا کہ اُسے بس مرکرمٹی ہوجانا ہے اور دُنیا سے اس طرح گذر جانا ہے کہ زندگی کے افعال اور اعمال کا کوئی نتیجہ برآمد ہی نہ ہوگا۔ نہیں، وہ تو پختہ یقین رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر ایک زندگی ہے جس میں خدا کے سامنے حاضر ہوکر اُسے اپنے ایک ایک کام کا، ایک ایک حرکت کا اور ایک ایک ذرے کا حساب دینا ہے۔ اسی چیز کو نبی صلعم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:۔

اَلَا کلکم راعٍ وکلکم مسئولٌ عن رعیتہٖ

خبردار! تم میں سے ہر ایک راعی ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک کو اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہی کرنی ہے

رعیت سے مراد وہ سب کچھ ہے جو آدمی کے چارج میں دیا گیا ہے۔ چاہے وہ بال بچے ہوں، یا نوکر اور ماتحت ہوں، یا جانور اور اسباب زندگی ہوں۔ جس کسی پر بھی انسان کا حکم چلتا ہو اور جو کوئی اس کے تابع ہو وہی اس کی رعیت ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے دنیا میں کوئی بھی بے رعیت نہیں ہے۔ ہر ایک کسی نہ کسی دائرے میں راعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورت گھر کی راعی ہے۔ شوہر بال بچوں کا راعی ہے۔ افسر ماتحتوں کا راعی ہے۔ حکمراں ملک کی پوری آبادی کا راعی ہے۔ آقا اپنے ملازموں کا راعی ہے۔ بہرحال ہر انسان کسی نہ کسی کا راعی ضرور ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے چارج میں ضرور ہے۔ اسی رعیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم آدمی کو متنبہ فرماتے ہیں کہ خبردار رہو، تم اپنی رعیت کے ذمہ دار ہو اور تمھیں اپنے خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہوگی کہ تم نے اپنی رعیت پر اپنے اختیارات کس طرح استعمال کئے۔ یہ عقیدہ مسلمان کی زندگی کو ایک ذمہ دارانہ زندگی بناتا ہے۔ مسلمان کبھی اس طرح کی زندگی بسر نہیں کرسکتا کہ جو کچھ چاہے کھائے، جو کچھ چاہے پیئے، جو کچھ چاہے پہنے، جن مشاغل میں چاہے اپنی قوتیں اور اپنا وقت صرف کرتا رہے اور جدھر خواہشات نفس لے جائیں اُدھر آزادی سے بڑھتا چلا جائے۔ وہ کوئی چھوٹا ہوا جانور نہیں ہوتا کہ جس کھیت میں چاہے گھس جائے، جہاں ہرا چارہ نظر آجائے اس پر مُنہ مار دے اور جس راستے کی طرف مُنہ اٹھ جائے اسی پر دوڑنے لگے۔ مسلمان کی زندگی کی صحیح مثال وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان

فرمائی ہے کہ:۔

مثل المؤمن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اٰخیتہ یجول ثم یرجع الی اٰخیتہ

یعنی مسلمان اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹے سے بندھا ہوا گھوڑا ہوتا ہے کہ چاہے وہ کتنی ہی گردشیں اور جولانیاں دکھلائے بہرحال اس کے گلے کی رسی اُسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد اپنے کھونٹے کی طرف پلٹ آئے۔ مسلمان جب ایمان کے کھونٹے اور طاعت کی رسی سے بندھا ہوا ہے تو چاہے رسی کتنی ہی لمبی ہو بہرحال وہ ایک خاص دائرہ کے اندر ہی اندر گھوم پھر سکتا ہے، اس کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ وہ اپنی ساری قوتیں اور کوششیں اسی حد کے اندر صرف کر سکتا ہے جو خدا اور رسولؐ نے مقرر کر دی ہیں۔ اس کی ساری دلچسپیاں، ساری تفریحیں، ساری سرگرمیاں، اور تمام کارروائیاں مقررہ حدود کے اندر ہی محدود رہیں گی۔ ان حدوں سے باہر جانے کی جرأت وہ نہیں کر سکتا۔

جماعتِ اسلامی کا مطالبہ اسلام کی اس مختصر تشریح کے بعد آپ میں عرض کروں گا کہ ہم یعنی جماعتِ اسلامی کے خادم اور کارکن کیا چاہتے ہیں۔

ہماری دعوت سب لوگوں کو یہ ہے کہ وہ اسلام کو، جس کی حقیقت یہ ہے، اچھی طرح جانچ کر پرکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ وہ اسے اپنی زندگی کے دین کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ جیسا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اسلام پیدائش سے حاصل نہیں ہوتا، نسل اور نسب سے نہیں مل جاتا۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس سوال کو آپ کے سامنے رکھا جائے اور آپ سے صاف صاف پوچھا جائے کہ آیا فی الواقع آپ اسے بخوشی و رغبت قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ اس کی عائد کردہ پابندیوں کو اٹھانے پر راضی ہیں یا نہیں؟ آپ کو ایمان کے کھونٹے اور طاعت کی رسی سے بندھ جانا منظور ہے، یا نہیں؟ اگر کسی کو یہ دین اپنے لئے پسند نہ ہو اور اسلام کے اصول و حدود کے اندر رہنا گوارا نہ ہو تو اُسے پورا اختیار ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ لیکن چھوڑنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صاف صاف اسے رد کر دے، اپنا نام بدلے، اپنا تعلق مسلمان سوسائٹی سے منقطع کرے، اپنے آپ کو مسلمان کہنا چھوڑ دے، اور پھر آزادی کے ساتھ جس راہ پر جانا چاہے جائے، اپنے نئے مسلک کے مطابق جو نام پسند ہو اُسے اختیار کرلے، اور جو سوسائٹی مرغوب ہو اس میں شامل ہو جائے یا اپنے ہم خیال

لوگوں کو ساتھ لے کر کوئی نئی سوسائٹی بنائے۔ بہر حال یہ فریب اور یہ مسخرا پن اب ختم ہونا چاہئیے جو آجکل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ اسلام پسند بھی نہیں ہے، اس کی پیروی پر راضی بھی نہیں ہیں، خیال اور عمل میں اسے چھوڑ کر دوسرے طریقے اختیار بھی کر چکے ہیں مگر اصرار ہے کہ ہم مسلمان ہیں، اور صرف مسلمان کہلائے جانے پر ہی مصر نہیں بلکہ اسلام کے علمبردار اور اس کے مفتی بھی بنے پھرتے ہیں۔ یہ کھیل بہت دنوں کھیلا جا چکا۔ اب ہم اسے چلنے نہیں دیں گے۔ اسی طرح اب یہ منافقانہ رویہ بھی ختم ہو جانا چاہئیے کہ اسلام کی جو چیزیں اپنے مفاد اور اغراض کے مطابق نظر آئیں وہ تو قبول کر لی جائیں اور جو چیزیں خواہشاتِ نفس کے مطابق نہ ہوں انھیں رد کر دیا جائے۔ یہ افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض کا مصداق ہے جس کا طعنہ نبی صلعم کی زبان سے یہودیوں کو دیا گیا تھا کہ کتاب الٰہی سے اپنی پسند کی چیزوں کو تو لے لیتے ہو اور جو پسند نہ ہوں انھیں رد کر دیتے ہو؟ یہ نفس پرستی اور خواہش کی بندگی کا جعلی سکہ اب ایمان کے نام سے نہیں چل سکتا۔ کسی شریف آدمی کے لئے بھی یہ جعل سازی اور فریب کاری باعزت نہیں ہے کہ اپنے مطلب کے لئے تو وہ مسلمان ہو اور اسلام کے نام پر اپنے حقوق مانگے مگر اسلام کی پیروی کے لئے وہ مسلمان نہ ہو۔ ہم ہر شخص کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں اور اس کا دو ٹوک جواب چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام اپنے طریق زندگی کی حیثیت سے پسند ہے یا نہیں؟ پسند نہیں ہے تو براہِ کرم صاف انکار کرو اور ملت کے دائرہ سے باہر جاؤ۔ پسند ہے اور درحقیقت تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو سچے دل سے اُسے قبول کرو، اسلام کے ایک جز یا چند اجزاء کو نہیں بلکہ پورے اسلام کو لو، سیدھی طرح اطاعت کا رویہ اختیار کرو اور اسلام کو اپنا دین مان لینے کے بعد پھر آزادی کا دعویٰ مت کرو۔ مسلمان ہونے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق رہتا ہی نہیں ہے کہ ہم اپنی عقل اور اپنی پسند کے مطابق جو طریقے چاہیں گے اختیار کریں گے۔ اسلام اس آزادی کو آپ کا حق نہیں مانتا۔

یہ بات ہمیں صرف مردوں ہی سے نہیں کہنی ہے، بلکہ عورتوں سے بھی یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔ ہم عورتوں سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیتوں کو مردوں کی شخصیتوں میں گم نہ کر دیں۔ اپنے دین کو مردوں کے حوالے نہ کریں۔ وہ مردوں کا ضمیمہ نہیں ہیں۔ ان کی اپنی ایک مستقل شخصیت ہے۔ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح خدا کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال و افعال کا خود حساب دینا ہے۔ قیامت کے روز

ہر عورت اپنی ہی قبر سے اُٹھیگی، اپنے باپ یا شوہر یا بھائی کی قبر سے نہیں اٹھیگی۔ اپنے اعمال کا حساب دیتے وقت وہ یہ کہکر نہ چھوٹ جائیگی کہ میرا دین میرے مردوں سے پوچھو۔ اپنے طریق زندگی کی وہ خود ذمہ دار ہے۔ اسے خُدا کے سامنے اس بات کی جواب دہی کرنی ہوگی کہ وہ جس طریقہ پر چلتی رہی کیا سوچ کر چلتی رہی۔ لہٰذا ہم عورتوں کا سوال مردوں کے سامنے نہیں بلکہ خود عورتوں ہی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اپنی راہ زندگی کا فیصلہ تم خود کرو اور اس امر کا لحاظ کئے بغیر کرو کہ تمہارے مردوں کا فیصلہ کیا ہے۔ اسلام تمہیں اپنے دین کی حیثیت سے پسند ہے یا نہیں؟ اس کے اصول، اس کے حدود، اس کی عائد کی ہوئی پابندیاں، اس کی ڈالی ہوئی ذمہ داریاں، غرض ساری ہی چیزیں دیکھ کر فیصلہ کرو کہ وہ تمہیں قبول ہیں یا نہیں؟ اگر ان سب چیزوں کے ساتھ اسلام قبول ہے تو سچے دل سے اس کی پیروی کرو۔ ادھورے نہیں بلکہ پورے اسلام کو اپنا دین بناؤ۔ اور پھر جان بوجھ کر اس سے انحراف نہ کرو۔ اور اگر قبول نہیں ہے تو شرافت اور سچائی اسی میں ہے کہ صاف صاف اور علانیہ اسے چھوڑ دو اور اس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔

یہ بات ایک مدّت سے ہم کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اگر ہمارے لٹریچر سے کچھ واقفیت ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم نے ہمیشہ اپنے ارکان اور ہمدردوں سے یہی کہا ہے کہ آپ گھر کی عورتوں، ماؤں، بہنوں، بیویوں، بیٹیوں پر اسلام کی تبلیغ ضرور کریں، مگر خدا کے لئے انھیں قوّامیت کے زور سے اپنے مسلک کی طرف نہ کھینچیں۔ انہیں سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی پوری آزادی دیجئے۔ تبلیغ کا حق بس اتنا ہی ہے کہ آپ اسلام کے مطالبہ کو ان کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بعد عورتوں کو اس امر کا فیصلہ خود کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے کہ انہیں یہ مطالبہ قبول ہے یا نہیں۔

مسلم عورت کے فرائض

اس طرح سوچ سمجھ کر جو خواتین بطور خود اسلام کو اپنا دین بنائیں ان کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کے کرنے کے کام کیا کیا ہیں۔

اپنی اصلاح

آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنے

اندر سے جاہلیت کی ایک ایک چیز کو چن چن کر نکالیں - اپنے اندر یہ تمیز پیدا کریں کہ کیا چیزیں اسلام کی ہیں اور کیا چیزیں جاہلیت کی ہیں - پھر اپنی زندگی کا گہرا جائزہ لیں اور بے لوث محاسبہ کر کے دیکھیں کہ اس میں جاہلیت کا کوئی اثر تو نہیں پایا جاتا - ایسے جو اثرات بھی ملیں اُن سے اپنی زندگی کو پاک کیجئے اور اپنے خیالات کو، اپنی معاشرت کو، اپنے اخلاق کو اور اپنے پورے طرزِ عمل کو دین کے تابع کر دیجئے -

گھروں کی تطہیر

آپ کا دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے گھر کی فضا کو درست کریں - اس فضا میں پرانی جاہلیت کی جو جو رسمیں چلی آ رہی ہیں ان کو بھی نکال باہر کریں اور نئے زمانہ کی جاہلیت کے جو اثرات انگریزی دور میں ہمارے گھروں میں داخل ہو گئے ہیں، انھیں بھی خانہ بدر کریں - اس وقت ہمارے گھروں میں پرانے زمانہ کی جاہلیت اور نئے زمانہ کی جاہلیت کا ایک عجیب مرکب رائج ہے - ایک طرف وہ "روشن خیالی" ہے جو ہماری مسلمان خواتین کو فرنگیت زدہ شکل میں لا رہی ہے - اور دوسری طرف اسی روشن خیالی کے ساتھ ساتھ پرانے زمانہ کے جاہلانہ تخیلات، مشرکانہ عقیدے اور ہندوانہ رسمیں بھی ہماری معاشرت میں برقرار ہیں - اب جن خواتین کو اپنے ایمانی فرائض کا احساس ہو جائے ان کا کام یہ ہے کہ پرانی جاہلیت کی رسموں اور تصورات کو بھی چن چن کے گھروں سے نکالیں اور نئے زمانہ کی جاہلیت کے ان مظاہر کا بھی خاتمہ کریں جو فرنگی تعلیم اور انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید کی بدولت گھروں میں گھس آئے ہیں

نئی نسل کی صحیح تربیت

آپ کا تیسرا کام یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو اسلامی طرز پر تربیت دیں - ہماری نئی نسلیں اس لحاظ سے بڑی بد قسمت ہیں کہ گھروں کے اندر کبھی قرآن کی آواز ان کے کانوں میں نہیں پڑتی - اور نہ وہ اپنی آنکھوں سے گھر کے لوگوں کو کبھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں - ہم اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ بچپن میں ہم اپنے گھروں میں قرآن کی آواز سنتے تھے اور اپنے بڑوں کو نمازیں پڑھتے دیکھتے تھے - ہمارے گرد و پیش بہر حال کچھ نہ کچھ آثارِ دین کے باقی تھے لیکن موجودہ نسل کی یہ بد قسمتی انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ گھروں کی جس فضا میں وہ پرورش پا رہی ہے اس میں نہ قرآن کی آواز کبھی گونجتی ہے، نہ نماز کا منظر کبھی سامنے آتا ہے - اگر ہمارے گھروں کا یہی حال رہا اور نسلیں اسی طرح غلط تربیت حاصل کرتی رہیں تو جب زندگی کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آئے گی

اس وقت شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکے گا۔ آپ اب اس صورت حال کو ختم کریں اور اس فکر میں لگ جائیں کہ گھروں کی معاشرت میں، روزمرہ کے رہن سہن میں، زندگی کے مختلف معمولات میں اسلام نمودار ہو اور وہ ہمارے بچوں کو آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آئے۔ بچے اسے دیکھیں، اس کا مزہ چکھیں اور اس سے اثر قبول کریں۔ ان کے کانوں میں بار بار قرآن کی آواز پڑے، وہ دن میں پانچ مرتبہ گھروں میں نماز کا منظر دیکھیں، پھر وہ اپنی فطرت کے تحت اپنے بڑوں کی تقلید کریں اور انھیں نماز پڑھتے دیکھ کر خود بخود ان کی نقل اُتاریں۔ وہ توحید کا پیغام سنیں۔ وہ رسالت کا مدعا سمجھیں۔ اسلام کا نقش ان کے دلوں پر قائم ہو۔ ان کی عادات درست ہوں۔ ان کے اندر اسلامی ذوق پیدا ہو۔ نئی نسل کے لئے یہ سب کچھ ہمیں درکار ہے۔ پس وہ تمام عورتیں جو اسلام کو قبول کریں انھیں چاہیے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی گودوں کو اور اپنے گھروں کو مسلمان بنائیں تاکہ ان میں ایک مسلمان نسل پروان چڑھ سکے

مردوں پر اثر اندازی

آپ کا چوتھا کام یہ ہے کہ اپنے گھر کے مردوں پر اثر ڈالیں اور اپنے شوہروں، باپوں، بھائیوں اور بیٹوں کو اسلامی زندگی کی طرف بلائیں۔ عورتوں کو اپنے متعلق نہ معلوم یہ غلط فہمی کہاں سے لاحق ہوگئی ہے کہ وہ مردوں کو متاثر نہیں کرسکتیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں پر بہت گہرے اثرات ڈالتی ہیں اور ڈال سکتی ہیں۔ مسلمان لڑکی اگر یہ کہنے لگے کہ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شکل پسند ہے اور چرچل اور ٹرومین اور اسٹالن کی شکل پسند نہیں ہے، تو آپ دیکھیں گی کہ کس طرح مسلمان نوجوانوں کی شکلیں بدلنی شروع ہو جائینگی۔ مسلمان عورت اگر کہنے لگے کہ اسے کالے "صاحب لوگوں" کا طرز زندگی مرغوب نہیں ہے بلکہ وہ اسلامی زندگی مرغوب ہے جس میں نماز ہو، روزہ ہو، پرہیزگاری اور حسن اخلاق ہو، خدا کا خوف اور اسلامی آداب و تہذیب کا لحاظ ہو تو آپ کی آنکھوں کے سامنے مردوں کی زندگیاں بدلنے لگیں گی۔ مسلمان بیوی اگر صاف صاف کھول کر کہہ دے کہ اسے حرام کی کمائی سے سجائے ہوئے ڈرائنگ روم پسند نہیں ہیں، رشوت کے روپے سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا

گوارا نہیں ہے، بلکہ وہ حلال کی محدود کمائی میں روکھی سوکھی کھا کر جھونپڑے میں رہنا زیادہ عزیز رکھتی ہے تو حرام خوری کے بہت سے اسباب ختم ہو جائینگے اور کتنی ہی رائج الوقت خرابیوں کا ازالہ ہو جائیگا۔

برادری اور قریبی معاشرے پر اثر اندازی

اسی طرز پر اگر وہ تمام بہنیں اصلاح احوال کی مہم شروع کر دیں جنہوں نے اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے تو وہ اپنے اعزہ و اقربا، اپنے خاندان کے لوگوں اور اپنے میل ملاپ رکھنے والے گھرانوں کو بھی بہت سی خرابیوں سے بچا سکتی ہیں۔ اور انہیں نئی اور پرانی جاہلیتوں سے پاک کر سکتی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ بہترین طریقے سے اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں کے سامنے جاہلیت کے طریقوں پر تنقید کریں۔ انہیں اسلام کے احکام سمجھائیں، ان کو اسلام کی حدود سے آگاہ کریں اور خود اسلامی حدود کی پابندی کر کے اپنا صحیح نمونہ اُن کے سامنے پیش کریں۔ یوں اگر کام کیا جائے تو ہماری سوسائٹی کا پورا ڈھانچہ درست ہو سکتا ہے۔

ایک فیصلہ طلب سوال

پھر اگر آپ نے اسلام کو فی الواقع اپنے لئے پسند کر لیا ہے تو آپ کے سامنے یہ سوال دو ٹوک فیصلہ کے لئے آن کھڑا ہوگا کہ آیا آپ جاہلیت کی پیروی اور اسلام سے بغاوت میں اپنے غلط کار مردوں کی رفاقت کرنے کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں۔ اگر آپ نے واقعی اسلام کو پسند کر لیا ہے تو پھر آپ کو اس سوال کا جواب لازماً نفی میں دینا ہوگا۔ آپ کے لئے یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے آپ خود اپنی عاقبت خراب کر لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

ان شر الناس منزلۃ یوم القیٰمۃ عبدٌ اذھب آخرتہ بدنیا غیرہٖ

"قیامت کے روز بد ترین حال اس شخص کا ہوگا جس نے دوسرے کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی عاقبت خراب کر لی"

لہٰذا آپ اپنے مردوں کی دُنیا بنانے کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ مسلمان خاتون ہونے کی حیثیت سے آپ شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے ہر ایک پر یہ واضح کر دیں کہ ہم اسلام کے اتباع

میں آپ کی رفاقت کر سکتی ہیں لیکن اگر آپ کو اسلام کی حدود کی پابندی گوارا نہیں ہے تو آپ جانیں اور آپ کا کام، ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ آپ کی دنیا کے لئے اپنی آخرت بگاڑنے پر ہم تیار نہیں ہیں۔

دوسری طرف جن خواتین کے شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے خدا و رسول کی پیروی کرنے والے ہوں ان کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ پوری طرح تعاون کریں اور تکلیفوں میں ان کا ساتھ دیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص اسلام کی حدود کے اندر رہنے کا فیصلہ کریگا وہ دولت کمانے میں ہر طرح کے مال پر ہاتھ نہیں مار سکتا۔ وہ حرام خوری نہیں کر سکتا۔ وہ حلال طریقوں سے محدود کمائی کر کے عیاشی کے سامان فراہم نہیں کر سکتا۔ پس مسلمان خاتون کو حلال کی تھوڑی کمائی پر قناعت کرنی چاہیئے اور اسلام پر چلنے والے باپوں، شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں پر یہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہیئے کہ وہ ان کے لئے عیش و عشرت اور لطف و لذت کے سامان فراہم کریں۔ اسی طرح دین حق کی اطاعت اور اس کو قائم کرنے کی کوشش میں مردوں کو بہت سی تکلیفوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور مسلمان خواتین کا فرض ہے کہ اِن تکالیف میں وہ اپنے حق پرست مردوں کی سچی رفیق ثابت ہوں۔

نازک وقت آرہا ہے

اس وقت ہمارے سامنے ایک بہت بڑے کام کا پروگرام ہے۔ ہمیں پاکستان میں اسلام کی حکومت قائم کرنی ہے۔ اور یہ کام بہت بڑی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تک اس ملک کے رہنے والے خود مختار نہ تھے۔ لیکن ۱۵ اگست کے بعد ہمارے ملک کی صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب اس ملک کے لوگ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے میں پوری طرح مختار ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو اب یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنے لئے کس طریقِ زندگی کو، کس اصول اخلاق کو اور کس نظام حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ عنقریب دیکھیں گی کہ اس ملک میں ایک شدید کشمکش برپا ہونے والی ہے۔ ایک طرف نام نہاد مدعیان اسلام ہیں جن کو صرف اسلام کا نام باپ دادا سے ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن اس کو طریقِ زندگی کی حیثیت سے انھوں نے نہ قبول کیا ہے نہ قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اسلام کے نام پر جو حقوق حاصل ہو سکتے ہیں انھیں تو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جن پابندیوں کا اسلام مطالبہ کرتا ہے۔

اُن سے وہ خود بھی آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ملک کو بھی آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر کافرانہ حکومت قائم رکھنے اور کافرانہ قوانین جاری کرنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے مقابلہ میں وہ سب لوگ ہیں جو اسلام کو اپنے طریق زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حکومت قائم ہو اور اسلام کا قانون جاری ہو۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان عنقریب ایک کشمکش رونما ہونے والی ہے۔ اس موقعہ پر جس طرح مردوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اسلام نما کفر کا ساتھ دیں گے یا حقیقی اسلام کی حمایت کریں گے، اسی طرح مسلمان خواتین کو بھی یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالیں گی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کشمکش میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں۔ بہر حال بہنوں اور ماؤں سے میں درخواست کرونگا کہ اپنے مستقبل کے طرزِ عمل کا سوچ سمجھکر فیصلہ کریں۔ اگر وہ اسلام کو دل سے چاہتی ہیں تو انہیں اس کشمکش میں اپنا پورا وزن حقیقی اسلام کے پلڑے میں ڈالنا ہوگا۔

حکومت اور رائے عام

یہ دور چونکہ جمہوریت کا دور ہے اس لئے حکومت کے مسلک کا انحصار عوام کی رائے پر ہے۔ حکومت کے اختیارات عوام کے دئے ہوئے اختیارات ہیں۔ پس حکومت اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے عوام واقعی مسلمان نہ ہوں۔ عام لوگ اگر اسلام کا کلمہ نہ پڑھیں، اور خدا کو اپنا حاکم و مالک نہ مانیں اور اسلام کو خود اپنے طریق زندگی کی حیثیت سے قبول نہ کریں تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ حکومت کلمہ پڑھ لے اور خدا کو حاکم مان کر اس کے دین کی پابند ہو جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے عوام، جو مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں، اب جان بوجھ کر کلمہ پڑھیں، اور نظام اسلامی کو اپنی عملی زندگی کے لئے برضا و رغبت انتخاب کر لیں۔ جب وہ یوں کلمہ پڑھ کر اسلام کو اختیار کر لیں گے تو ان کی رائے سے جو حکومت بنیگی وہ حکومت بھی کلمہ گو حکومت ہوگی اور خدا کے آگے جھکنے والی اور اُس کے قانون کو جاری کرنے والی ہوگی۔

اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے آپ سے خاص طور پر کہنی ہیں۔ اسلامی حکومت کے متعلق آجکل یہ غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں کہ اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو ایک بڑا تاریک دور ملک پر

مسلط ہو جائیگا اور قوم کی ساری ترقی رُک جائیگی خصوصیت سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اسلامی نظام میں عورتوں کی پوزیشن گر جائیگی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو وہ عورتوں کے لئے بھی ویسی ہی برکت ثابت ہوگی جیسی مردوں کے لئے۔ میں مختصر طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی حکومت میں آپ کی کیا پوزیشن ہوگی۔

اسلامی حکومت میں خواتین کے حقوق

(۱) اسلام موجودہ زمانہ کی جمہوریت سے سینکڑوں برس پہلے عورتوں کے حق رائے دہی کو تسلیم کر چکا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب عورت کی مستقل شخصیت ہی سے انکار کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ عورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ شیطان کی ایک ایجنٹ ہے۔ ایسے تاریک دور میں اسلام نے سب سے پہلے عورت کی مستقل شخصیت کا اثبات کیا اور اسے اجتماعی معاملات میں رائے دینے کا حق بخشا۔ اسلامی حکومت میں ہر بالغ عورت کو ووٹ کا حق اسی طرح حاصل ہوگا جس طرح ہر بالغ مرد کو یہ حق دیا جائیگا۔

(۲) اسلام عورتوں کو وراثت اور مال و جائداد کی ملکیت کے پورے پورے حقوق دیتا ہے۔ ان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے روپیہ کو تجارت و صنعت میں لگائیں اور اس سے جو نفع ہو اس کی بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔ بلکہ اگر ان کے پاس وقت بچتا ہو تو ان کو اس کا بھی حق ہے کہ بطور خود کوئی کاروبار یا کوئی محنت مزدوری کریں۔ اس کی آمدنی کی ملکیت پوری طرح انہی کو حاصل ہوگی۔ ان کے شوہروں اور باپوں کو ان کے املاک پر کسی قسم کے اختیارات از روئے شرع حاصل نہیں ہیں۔

(۳) اسلامی حکومت میں یہ ناقص ازدواجی قانون جو انگریزی دور میں یہاں رائج رہا ہے اور جس نے بہت سی مسلمان عورتوں کے لئے دُنیا کی زندگی کو دوزخ کی زندگی بنا رکھا ہے بدل دیا جائیگا۔ اور اسلام کا حقیقی قانون ازدواج جاری کیا جائیگا جو عورتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری حفاظت کرتا ہے۔ یہ نام نہاد شریعت بل جو ابھی ابھی پاکستانی پنجاب کی اسمبلی میں پاس کیا گیا ہے، یہ پوری طرح شریعت کے قانون پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ یہ قانون شریعت کی ایک مسخ شدہ شکل ہے۔ میری کتاب "حقوق الزوجین" اگر

آپ کے مطالعہ میں آئی ہو تو آپ پر واضح ہو چکا ہوگا کہ مردوں اور عورتوں۔ دونوں کے حقوق اور مفاد کی مکمل حفاظت اسلام کے قانون کے سوا اور کسی قانون میں نہیں ہے۔ اسلام کی حکومت میں ایسا ازدواجی قانون نافذ ہوگا جو آپ کی ساری شکایات ختم کر دیگا۔

(۴) اسلامی حکومت میں عورتوں کو تعلیم سے محروم نہیں رکھا جائیگا جیسا کہ غلط فہمیاں پھیلانے والے لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے بلکہ اُن کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائیگا۔ یہ انتظام بقیناً آجکل کے گرلز اسکولوں اور گرلز کالجوں کے طرز پر نہ ہوگا اور مخلوط تعلیم کے اصول پر تو ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں اسلامی حدود کی پوری پابندی کی جائیگی۔ مگر بہر صورت ہر شعبے میں اونچے معیار کی زنانہ تعلیم کے انتظامات ضرور کئے جائیں گے۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ اسلام کی حدود کو اگر برقرار رکھنا ضروری ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ گرلز میڈیکل کالج چلائے جا سکیں؟ میں کہتا ہوں کہ اگر حکومت اسلام کا کلمہ پڑھ لے اور اسلامی اصول پر کام کرنے کا فیصلہ کرے تو ایسے ذرائع فراہم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے جن سے اسلامی طرز کا ایک زنانہ میڈیکل کالج قائم کیا جا سکے۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ماہر اور تجربہ کار مسلمان لیڈی ڈاکٹروں کو، جو ملک میں موجود ہیں، عورتوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دینے پر مامور کر دیں۔ یا اگر بالفرض وہ فراہم نہ ہو سکیں تو ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اپنی قوم میں سے سن رسیدہ ڈاکٹروں کو، جن کی سیرت قابل اعتماد ہو، منتخب کر لیں اور اُن کے سپرد یہ خدمت کریں کہ چند سال کے اندر اچھی لیڈی ڈاکٹرنیوں کا ایک معتد بہ گروہ تیار کر دیں۔ پھر ہم عورتوں کو مردوں سے تعلیم دلانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائینگے۔ اسی طرح ہر دوسرے شعبے کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام کیا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اسلام کی حدود توڑنے کی کوئی ضرورت پیش آئے۔

(۵) ہم مسلمان عورتوں کو ضروری فوجی تعلیم دینے کا بھی انتظام کریں گے اور یہ بھی ان شاء اللہ اسلامی حدود کو باقی رکھتے ہوئے ہوگا۔ میں بارہا اپنے رفقاء سے کہہ چکا ہوں کہ اب قومیت کی لڑائیاں حد سے بڑھ چکی ہیں۔ اور انسان درندگی کی بد سے بدتر شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ ہمارا سابقہ ایسی ظالم طاقتوں سے ہے جنھیں انسانیت کی کسی حد کو بھی پھاند جانے میں تامل نہیں ہے۔ کل اگر خدانخواستہ کوئی جنگ پیش

آجائے تو نہ معلوم کیا کیا بربریت ان سے صادر ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو مدافعت کے لئے تیار کریں۔ اور ہر مسلمان عورت اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرنے پر قادر ہو۔ انھیں اسلحہ کا استعمال سیکھنا چاہیئے، انھیں تیرنا آتا ہو، سواری کر سکتی ہوں سائیکل اور موٹر چلا سکیں، فسٹ ایڈ جانتی ہوں۔ پھر وہ صرف اپنی ذاتی حفاظت ہی کی تیاری نہ کریں، بلکہ ضرورت ہو تو جنگ میں مردوں کا ہاتھ بٹا سکیں۔ ہم یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اسلامی حدود کے اندر کرنا چاہتے ہیں۔ ان حدود کو توڑ کر نہیں کرنا چاہتے۔ قدیم زمانے میں بھی مسلمان عورتوں نے اسلحہ کے استعمال اور مدافعت کے فنون کی تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن انہوں نے پورے فنون سپہ گری اپنے باپوں، اور بھائیوں اور شوہروں سے سیکھے تھے اور پھر عورتوں سے عورتوں کو تربیت دی تھی۔ اب بھی یہ صورت بآسانی اختیار کی جا سکتی ہے کہ فوجی لوگوں کو اپنی محرم خواتین کی فوجی تربیت پر مامور کیا جائے۔ اور پھر جب عورتیں کافی تعداد میں تیار ہو جائیں تو ان کو دوسری عورتوں کے لئے معلم بنا دیا جائے۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کا فرق

یہ چند امور میں نے مثال کے طور پر بیان کئے ہیں جن سے آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ اسلامی حکومت میں عورت کو محض گڑیا بنا کر نہیں رکھا جائیگا جیسا کہ بعض نادانوں کا گمان ہے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ترقی کا موقع دیا جائیگا۔ بہرحال یہ ضرور سمجھ لیجئے کہ ہم عورت کو عورت ہی رکھ کر عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ اسے مرد بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں فرق یہی ہے کہ مغربی تہذیب عورت کو اس وقت تک کوئی عزت اور کسی قسم کے حقوق نہیں دیتی جب تک کہ وہ ایک مصنوعی مرد بن کر مردوں کی ذمہ داریاں اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہو جائے۔ مگر ہماری تہذیب عورت کو ساری عزتیں اور تمام حقوق عورت ہی رکھ کر دیتی ہے اور تمدن کی انہی ذمہ داریوں کا بار اس پر ڈالتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہیں۔ اس معاملہ میں ہم اپنی تہذیب کو موجودہ مغربی تہذیب سے بدرجہا زیادہ افضل اور اشرف سمجھتے ہیں۔ اور نہایت مضبوط دلائل کی بنا پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ہی تہذیب کے اصول صحیح اور معقول ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ صحیح اور پاکیزہ چیز کو چھوڑ کر ہم غلط اور گندی چیز کو

قبول کریں۔ موجودہ زمانہ کی مخلوط سوسائٹی سے ہمارا اختلاف کسی تعصب یا اندھی مخالفت کا نتیجہ نہیں ہے ہم پوری بصیرت کے ساتھ اپنی، آپ کی، اور پوری انسانیت اور انسانی تہذیب و تمدن کی فلاح اسی میں دیکھتے ہیں کہ اس تباہ کن طرزِ معاشرت سے اجتناب کیا جائے۔ ہمیں صرف عقلی دلائل ہی سے اس کے غلط ہونے کا یقین نہیں ہے بلکہ تجربہ سے اس کے جو نتائج ظاہر ہو چکے ہیں اور دنیا کی دوسری قوموں کے اخلاق و تمدن پر اس کے جو اثرات مرتب ہو چکے ہیں ان کو ہم جانتے ہیں۔ اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ ہماری قوم اس تباہی کے گڑھے میں گرے جس کی طرف ہمارے فرنگیت زدہ اونچے طبقے اسے دھکیلنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اخلاق کھو چکے ہیں ، اور اب ساری قوم کے اخلاق برباد کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری کوشش یہ ہے کہ ہماری قوم اور ہمارا ملک جو کچھ بھی ترقی کرے اسلامی اخلاق کے دائرے میں رہ کر کرے۔ مگر اپنی اس کوشش میں ہم اُسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب ہمارے بھائیوں کے ساتھ ہماری بہنوں کی بھی مجموعی طاقت ہماری تائید پر ہو۔

اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ فرنگیت چاہتی ہیں یا اسلام؟ ان دونوں میں سے ایک ہی کا آپ کو انتخاب کرنا ہوگا۔ دونوں کو خلط ملط کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ اسلام چاہتی ہوں تو پورے اسلام کو لینا ہوگا۔ اور اپنی پوری زندگی پر اسے حکمراں بنانا ہوگا۔ کیونکہ وہ تو صاف کہتا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ، تم پورے کے پورے میرے اندر آجاؤ، اپنی زندگی کا کوئی ذرا سا حصہ بھی میری اطاعت سے مستثنیٰ نہ کر رکھو۔ لیکن اگر یہ کلی اطاعت منظور نہ ہو اور کچھ فرنگیت ہی کی طرف میلان ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ دعوائے اسلام کو ملتوی رکھیں ۔ اور جس راہ پر چلیں نام بھی اسی کا لیں۔ آدھا اسلام اور آدھا کفر نہ دنیا ہی میں کسی کام کی چیز ہے نہ آخرت ہی میں اس کے مفید ہونے کا کوئی امکان ہے، اور پھر اس مرکب پر اسلام کا لیبل ایک جھوٹ بھی ہے۔

معراج کا پیغام

(یہ تقریر ۲۷ رجب ۱۳۶۷ھ کو ریڈیو پاکستان، لاہور سے نشر کی گئی تھی۔ حاشیہ میں جو توضیحات کی گئی ہیں وہ بعد کا اضافہ ہیں)

اسلام کی تاریخ میں دو راتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک وہ رات جس میں نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول شروع ہوا۔ دوسری وہ رات جس میں آپ کو معراج نصیب ہوئی۔ پہلی رات کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے کہ اُس میں نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے وہ روشن ہدایت نامہ بھیجا گیا جو باطل کی تاریکیوں میں حق کا نور صدیوں سے پھیلا رہا ہے، اور قیامت تک پھیلاتا رہیگا۔ لیکن دوسری رات کی اہمیت بعض دینیاتی بحثوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس رات میں انسانیت کی تعمیر کے لئے کتنا عظیم الشان کارنامہ انجام پایا۔ آج اس مبارک رات کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ یہ رات ہمارے لئے کیا پیغام لائی ہے۔

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ باوجودیکہ آپ کے مخالفین نے آپ کا راستہ روکنے کے لئے سارے ہی جتن کر ڈالے تھے، پھر بھی آپ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا تھا جس میں دو چار آدمی آپ کے ہم خیال نہ بن چکے ہوں۔ خود مکہ میں ایسے مخلص لوگوں کی ایک مختصر جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی تھی جن سے زیادہ سرگرم اور فداکار حامی دُنیا کی کسی تحریک کو کبھی نہیں ملے۔ اور مدینہ میں دو طاقتور اور خود مختار قبیلوں کی اکثریت آپ کی دعوت پر ایمان لا چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آگیا تھا کہ آپ مکہ سے مدینے منتقل ہو جائیں، تمام ملک کے منتشر مسلمانوں کو اپنے پاس سمیٹ لیں، اور ان اصولوں پر ایک ریاست قائم کر دیں جن کی اب تک آپ تبلیغ کرتے رہے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب آپ کو معراج کا سفر پیش آیا۔

اس سفر سے واپس آکر جو پیغام آپ نے دیا وہ قرآن مجید کی سترھویں سورۃ — سورہ بنی اسرائیل — میں آج تک لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ اس کو دیکھئے اور اس کے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھئے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کے اصولوں پر ایک نئی ریاست کا سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے وہ ہدایات دی جارہی ہیں جن پر نبی اور اصحاب نبی کو آگے کام کرنا تھا۔

اس پیغام میں معراج کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت دلائی گئی ہے۔ مصریوں کی غلامی سے نکل کر بنی اسرائیل نے جب آزاد زندگی شروع کی تھی تو خداوند عالم نے اُن کی رہنمائی کے لئے کتاب عطا فرمائی تھی۔ اور تاکید کردی تھی کہ میرے سوا اب اپنے معاملات کی تکمیل کسی اور کے ہاتھ میں نہ دینا۔ مگر بنی اسرائیل نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفران نعمت کیا اور زمین میں مصلح بننے کے بجائے مفسد و سرکش بن کر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ایک مرتبہ ان کو بابل والوں سے پامال کرایا، اور دوسری مرتبہ رومیوں کو ان پر مسلط کردیا۔ اس سبق آموز تاریخ کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ چیز ہے جو تمہیں ٹھیک راستہ بتائیگی۔ اس کی پیروی میں کام کروگے تو تمہارے لئے بڑے انعام کی بشارت ہے۔

دوسری اہم حقیقت جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ہی عمل اس کے حق میں فیصلہ کن ہے۔ سیدھا چلیگا تو آپ اپنا بھلا کریگا۔ غلط راہ پر جائیگا تو خود ہی نقصان اٹھائیگا۔ اس شخصی ذمہ داری میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہے، اور نہ کسی کا بار دوسرے پر پڑسکتا ہے۔ لہٰذا ایک صالح معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنی ذاتی ذمہ داری پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہوں، اسے پہلی فکر یہ ہونی چاہیئے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔

تیسری بات جس پر متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اُس کے بڑے لوگوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے خوشحال اور مالدار اور صاحب اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں۔ ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں، اور آخر

یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہئے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بد اخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں

پھر مسلمانوں کو وہ بات یاد دلائی گئی ہے جو قرآن میں بار بار دہرائی جاتی رہی ہے کہ اگر تمہارے پیشِ نظر صرف یہی دنیا اور اس کی کامیابیاں اور خوشحالیاں ہوں تو یہ سب کچھ تمہیں مل سکتا ہے۔ مگر اس کا آخری انجام بہت بُرا ہے۔ مستقل اور پائدار کامیابی جو اس زندگی سے لے کر دوسری زندگی تک کہیں نامرادی سے داغدار نہ ہونے پائے، تمہیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ تم اپنی کوششوں میں آخرت اور اُس کی بازپرس کو پیش نظر رکھو۔ دنیا پرست کی خوشحالی بظاہر تعمیر کی شان رکھتی ہے مگر اس تعمیر میں ایک بہت بڑی خرابی کی صورت مضمر ہے۔ وہ اخلاق کی اس فضیلت سے محروم ہوتا ہے جو صرف آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھنے ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ فرق تم دُنیا ہی میں دونوں طرح کے آدمیوں کے درمیان دیکھ سکتے ہو۔ یہی فرق بعد کی منازلِ حیات میں اور زیادہ نمایاں ہو جائیگا یہاں تک کہ ایک کی زندگی سراسر ناکامی اور دوسرے کی زندگی سراسر کامیابی بن کر رہیگی۔

اِن تمہیدی نصیحتوں کے بعد وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرے کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ ۱۴ اصول ہیں، اور میں انہیں اسی ترتیب سے آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں جس طرح وہ معراج کے اس پیغام میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ خدائے واحد کے سوا کسی کی خداوندی نہ مانی جائے۔ صرف وہی تمہارا معبود ہو۔ اسی کی تم بندگی و اطاعت کرو، اور اسی کے حکم کی پیروی تمہارا شعار رہے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تم نے تسلیم کیا، خواہ وہ کوئی غیر ہو یا تمہارا اپنا نفس، تو آخرکار تم قابلِ مذمت بن کر رہو گے اور اُن برکتوں سے محروم ہو جاؤ گے جو صرف خدا کی تائید سے ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔[1]

[1] یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ ہی نہ تھا بلکہ اُس سیاسی نظام کا، جسے بعد میں مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا، اولین بنیادی اصول بھی تھا۔ اس کی پوری عمارت اس نظریہ پر اٹھائی گئی تھی کہ خداوند عالم ہی مُلک کا مالک اور بادشاہ ہے۔ اور خدا کی شریعت ہی ملک کا قانون ہے۔

۲۔ انسانی حقوق میں سب سے اہم اور مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہئے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیئے جس میں اولاد والدین سے بے نیاز اور سرکش نہ ہو بلکہ ان سے نیک سلوک کرے، اُن کا احترام ملحوظ رکھے اور بڑھاپے میں ان کی وہی نازبرداری کرے جو کبھی بچپن میں وہ اس کی کر چکے ہیں۔[۵]

۳۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی، اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری وساری رہے۔ ہر رشتہ دار اپنے دوسرے رشتہ دار کا مددگار رہو۔ ہر محتاج انسان دوسرے انسانوں سے مدد پانے کا حق دار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرت میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنے اوپر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہے۔ ان کی کوئی خدمت کرے تو یہ سمجھے کہ وہ ان کا حق ادا کر رہا ہے نہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے اور اگر کسی خدمت کے قابل نہ ہو تو معذرت کرے اور خدا سے فضل مانگے تاکہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔[۶]

---

[۵]۔ اس دفعہ کی رو سے یہ طے کر دیا گیا کہ اسلامی نظام معاشرت کی بنا خاندان پر رکھی جائیگی اور خاندانی نظام کا محور والدین کا ادب واحترام ہوگا۔ بعد میں اسی دفعہ کے منشا کے مطابق والدین کے وہ شرعی حقوق معین کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں وہ خیالات داطوار پیوست کر دیئے گئے جو خدا اور رسول کے بعد والدین کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

[۶] اس دفعہ کی بنیاد پر مدینہ طیبہ کے معاشرے میں صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے احکام دیئے گئے، وصیت، وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کئے گئے، یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا، ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ وہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کرے، اور پھر اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ سے پورے معاشرے میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی ایسی روح پھونک دی گئی کہ لوگوں کے اندر قانونی حقوق کے ماسوا اخلاقی حقوق کا ایک وسیع ترین تصور پیدا ہوگیا، اور اس کی بنا پر لوگ (باقی صفحہ ۴۳ پر)

۴۔ لوگ اپنی دولت کو غلط طریقوں سے ضائع نہ کریں۔ فخر و ریا اور نمائش کے خرچ، عیاشی اور فسق و فجور کے خرچ، اور تمام ایسے خرچ جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہادیں، دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے بھائی ہیں اور ایک صالح معاشرے کا فرض ہے کہ ایسے بے جا صرفِ مال کو اخلاقی تربیت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ سے روک دے۔

۵۔ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیئے کہ وہ نہ تو بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع کریں۔ معاشرے کے افراد میں توازن کی ایک ایسی صحیح حس پائی جانی چاہیئے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بے جا خرچ کی خرابیوں میں بھی مبتلا نہ ہوں۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) خود بخود ایک دوسرے کے ایسے حق بھی پہچاننے اور ادا کرنے لگے جو کسی قانون کے رو سے نہ مانگے جاسکتے ہیں اور نہ دلوائے جاسکتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مدینہ کی سوسائٹی میں ان دونوں دفعات کے منشا کی ترجمانی مختلف طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازروئے قانون حرام کر دیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بھی بیجا صرفِ مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف حکومت کو یہ اختیارات دیئے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو وہ اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے اور جو لوگ اپنے مال میں بہت زیادہ ناروا طریقوں سے تصرف کرنے لگیں ان کی جائداد کو خود اپنے انتظام میں لے لے۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام بھی پیدا کی گئی جو فضول خرچیوں پر واہ واہ کرنے کے بجائے ملامت کرے، اور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے افراد کے نفس کی اصلاح بھی کی گئی تاکہ وہ بجا اور بے جا خرچ کے فرق کو خود سمجھیں اور بے جا خرچوں سے آپ ہی آپ باز رہیں۔ اسی طرح بخل کو بھی جس حد تک قانون کے ذریعہ سے توڑا جاسکتا تھا اس کے لئے قانون سے کام لیا گیا، اور باقی اصلاح کا کام رائے عام کے زور اور اخلاقی تعلیم کی طاقت سے لیا گیا۔ آج یہ اسی کا اثر ہے کہ مسلمان سوسائٹی میں کنجوسوں اور زراندوزوں کو جس بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کی مثال کسی دوسری سوسائٹی میں نہ ملیگی۔

۶۔ خدا نے اپنے رزق کی تقسیم کا جو نظام قائم کیا ہے، انسان اپنی مصنوعی تدبیروں سے اُس میں دخل انداز نہ ہو۔ اس نے اپنے سب بندوں کو رزق میں مساوی نہیں رکھا، بلکہ ان کے درمیان کم و بیش کا فرق رکھا ہے، اور اس کے اندر بہت سی مصلحتیں ہیں جن کو وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔ لہذا ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کئے ہوئے اِس طریقہ سے قریب تر ہو۔ فطری نامساوات کو ایک مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا، یا نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں یکساں غلط ہیں۔[1]

۷۔ نسلوں کی افزائش کو اس ڈر سے روک دینا کہ کھانے والے بڑھ جائینگے تو معاشی ذرائع تنگ ہو جائینگے، ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ جو لوگ اس اندیشے سے آنے والی نسلوں کو ہلاک کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ رزق کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ رازق وہ خدا ہے جس نے انسانوں کو زمین میں بسایا ہے۔ پہلے آنے والوں کے لئے بھی رزق کا سامان اسی نے کیا تھا اور بعد کے آنے والوں کے لئے بھی وہی سامان کریگا۔ جتنی آبادی بڑھتی ہے، خدا اسی نسبت سے معاشی ذرائع بھی وسیع کر دیتا ہے۔ لہذا لوگ خدا کے تخلیقی انتظامات میں بے جا دخل اندازی نہ کریں اور کسی قسم

[1] اس دفعہ میں قانونِ فطرت کے جس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیل سرے سے کوئی راہ ہی نہ پا سکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوت اور تفاضل بجائے خود کوئی بے انصافی ہے اور انصاف قائم کرنے کے لئے امیری اور غریبی کا فرق مٹانے اور ایک "بے طبقات" معاشرہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا کسی درجہ میں بھی مطلوب ہے۔ اس کے برعکس مدینہ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے جو راہ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرت اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور دفعات ۳، ۴، ۵ کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانین کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے اُن بے شمار اخلاقی و روحانی اور تمدنی فوائد کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

کے حالات میں بھی ان کے اندر "نسل کشی" کا میلان پیدا نہ ہونے پائے۔[۱]

۸۔ زنا عورت اور مرد کے تعلق کی بالکل ایک غلط صورت ہے۔ اس کو نہ صرف بند ہونا چاہیئے بلکہ معاشرے کے اندر اُن اسباب کا بھی سدّباب کیا جانا چاہیئے جو انسان کو اس کے قریب لے جاتے ہیں۔[۲]

۹۔ انسانی جان کو اللہ نے قابلِ احترام ٹھیرایا ہے۔ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی جان۔ خدا کی مقرر کی ہوئی یہ حُرمت صرف اسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جب کہ خدا ہی کا مقرر کیا ہوا کوئی حق اُس کے خلاف قائم ہو جائے۔ پھر حق قائم ہو جانے کے بعد بھی خونریزی صرف اس حد تک ہونی چاہیئے جہاں تک حق کا تقاضا ہو۔ قتل میں اسراف کی تمام صورتیں بند ہو جانی چاہئیں، مثلاً جوشِ انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا جن کے خلاف حق قائم نہیں ہوا ہے یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش کی بے حُرمتی کرنا، یا ایسی ہی دوسری انتقامی زیادتیاں جو دنیا میں رائج رہی ہیں۔[۳]

---

[۱] یہ دفعہ اُن معاشی بنیادوں کو قطعی طور پر منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے لیکر آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اُٹھتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں افلاس کا خوف قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا۔ اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن معراج کے پیغام کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر کھانے کے ذرائع بڑھانے کی تعمیری سعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے۔

[۲] یہ دفعہ آخرکار اسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اس کے منشا کے مطابق زنا اور تہمتِ زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا، پردے کے احکام جاری کئے گئے، فواحش کی اشاعت پر پابندیاں عائد کی گئیں، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر بندشیں لگائی گئیں، اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح نہایت آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کا خاتمہ کر دیا گیا۔

[۳] اس دفعہ کی بنیاد پر اسلامی قانون میں خودکشی کو حرام کیا گیا۔ قتلِ عمد کو جرم ٹھیرایا گیا (باقی صفحہ ۳۷ پر)

۱۰۔ یتیموں کے مفاد کی اُس وقت تک حفاظت ہونی چاہیئے جب تک وہ خود اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں۔ ان کے مال میں کوئی ایسا تصرف نہ ہونا چاہیئے جو خود ان کے مفاد کے لئے بہتر نہ ہو[۱]۔

۱۱۔ عہد و پیمان خواہ افراد ایک دوسرے سے کریں، یا ایک قوم دوسری قوم سے کرے، بہر حال ایمانداری کے ساتھ پورے کئے جائیں۔ معاہدوں کی خلاف ورزی پر خدا کے ہاں باز پرس ہوگی[۲]۔

۱۲۔ ناپ اور پیمانے اور اوزان ٹھیک رکھے جائیں اور لین دین میں صحیح تول تولی جائے[۳]۔

۱۳۔ تم کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کے صحیح ہونے کا تمہیں علم نہ ہو[۴]۔ اپنی سماعت اور بینائی کا اور اپنے دلوں کی نیتوں اور خیالات اور ارادوں کا تمہیں خدا کو حساب دینا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) قتل خطا کی مختلف صورتوں کے لئے خونبہا اور کفارے تجویز کئے گئے، اور قتل بالحق کو صرف تین صورتوں میں مقید کر دیا گیا، ایک یہ کہ کوئی شخص قتل عمد کا مرتکب ہوا ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی شادی شدہ مرد یا عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہو، تیسرے یہ کہ کسی شخص نے اسلامی نظام جماعت کے خلاف خروج کیا ہو۔ پھر قتل بالحق کا فیصلہ کرنے کے اختیارات بھی صرف قاضی شرع کو دئے گئے، اور اس کا ایک مہذب ضابطہ بنا دیا گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یہ محض ایک اخلاقی ہدایت ہی نہ تھی بلکہ یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لئے اسلامی نظامِ حکومت میں قانونی اور انتظامی دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیلات ہم کو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

[۲] یہ بھی صرف اسلامی اخلاقیات ہی کی ایک اہم دفعہ نہ تھی بلکہ آگے چل کر اسلامی حکومت نے اپنی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگ بنیاد بھی اسی دفعہ کو بنایا۔

[۳] اس دفعہ کے مطابق اسلامی حکومت کے محکمۂ احتساب پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک فرض یہ بھی عائد ہوا کہ وہ منڈیوں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔

[۴] اس دفعہ کا منشا یہ تھا کہ مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان اور قیاس کے بجائے "علم" کی پیروی کریں۔ اس منشا کی ترجمانی اخلاق میں، قانون میں، ملکی نظم و نسق (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۴)

۱۴- زمین میں جباروں اور متکبروں کی چال نہ چلو، تم نہ اپنی اکڑ سے زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ اپنے غرور میں پہاڑوں سے سربلند ہو سکتے ہو لہ

یہی وہ اصول تھے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے پہنچ کر اسلامی سوسائٹی اور اسلامی ریاست کی تعمیر فرمائی۔ (باجازت ریڈیو پاکستان)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷) اور سیاست میں اور نظام تعلیم میں مختلف طریقوں سے بہت وسیع پیمانے پر کی گئی اور ان بیشمار خرابیوں سے اسلامی معاشرے کو بچا لیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول مقرر کیا گیا کہ محض شبہ پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ طے کر دیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں بھی یہ پالیسی معین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے اور نہ شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظام تعلیم میں بھی ان تمام نام نہاد "علوم" کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کے اندر ایک حقیقت پسندانہ ذہنیت پیدا کی گئی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ یہ بھی محض ایک واعظانہ بات نہ تھی بلکہ درحقیقت اس میں مسلمانوں کو پیشگی تنبیہ کی گئی تھی کہ ایک حکمراں گروہ بننے کے بعد وہ غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ جو حکومت اس منشور کے مطابق مدینہ طیبہ میں قائم کی گئی اس کے فرمانرواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زبان یا قلم سے نکلا ہوا ایک جملہ بھی آج ہمیں ایسا نہیں ملتا جس میں ادائے تکبر کا ادنیٰ شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ جنگ میں بھی انہوں نے کبھی فخر و غرور کی کوئی بات زبان سے نہ نکالی۔ ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال اور عام برتاؤ، ہر چیز میں انکسار و تواضع کی شان پائی جاتی تھی، اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب جمانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

اِسلامی قانون

(یہ تقریر ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی)

آج کل کسی ملک میں — غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں — اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جائے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذب دور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائینگی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کرینگے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقے کی فقہ جاری ہوگی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائینگے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں، اور یہ برسات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سُن کر طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دور کی شناسائی اُنسیت کے بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوسناک باب یہ بھی ہے کہ آج محض اغیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین سے اور اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے عظیم الشان ترکہ سے نابلد اور متوحش ہیں۔ اس حالت کو ہم اچانک نہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ پہلے مدتہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علم و فنون کا نشو و نما معطل رہا۔ پھر اس جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا، اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہِ راست

غیرمسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں، یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و روح کی گہرائیوں تک اتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری امت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر امت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آرہا تھا۔ اُسی سے انھوں نے اصول لئے، اُسی کے علوم سیکھے، اُسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اُسی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہل دین کا گروہ بالکل گوشۂ خمول میں پھینک دیا گیا۔ اور تمام مسلمان قوموں میں کارفرمائی کی باگیں اور کارکن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیب جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لئے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں اُن کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوئے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دئے جاتے تھے۔[۵] اسی طرح جو ممالک غلام تھے اُن میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اُسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد مسلمان قومیں پہنچی ہوئی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دبائیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی ابجد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انھوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی روح و مزاج سے اتنی دور

---

[۵] اسلامی شریعت کی تنسیخ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی (باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

لے جا چکی ہے کہ اُس کو سمجھنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اِس وقت تک بیسویں صدی کے لئے بارھویں صدی کے مردان کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لئے کوئی ایسا گروہ موجود بھی نہیں ہے جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین وقانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس برعظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئین حیات رکھتے ہیں، ہمارے لئے مسلم وغیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابل قبول ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی، چنانچہ ۱۷۹۱ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہوگئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقش قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا میں محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۳ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرنچ کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرۂ اختیار میں چھوڑ دیے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ انھوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لئے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بھی وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیا میں تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا۔ اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان (باقی صفحہ ۴۱ پر)

جس کا نظام زندگی لامحالہ ہمارے آئین حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور ان تھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے، اور اس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو دینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئین حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لئے اتنے پاپڑ بیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیرات ہند اور ضابطۂ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا بُرا تھا کہ اتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا۔ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ "کار خیر" بھی ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جا سکتا تھا، اس کے لئے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اتنی جانفشانی اور اتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے کی حماقت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئینِ اسلامی کے نفاذ کے لئے پابند کر چکے ہیں، ہمارے لئے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ کرتی رہیں، ہمیں بہرحال ان ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے ان سب کو دور کرنے کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لئے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں، اور ان کے عدم اطمینان کی وجہ ان کی عدم واقفیت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ سے یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا مقصد اور اس کے اصول، اس کی روح اور اس کا مزاج کیا ہے، اس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) اور سعودی عرب ہی وہ ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی روح وہاں سے بھی غائب ہے۔

گیا ہے، اور اس میں کونسی چیز ابدتک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے، اس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو ان احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہوجائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن دماغ مطمئن ہوجائینگے اور ان کا اطمینان اُن ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دیگا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں ـــــ میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لئے ہے۔

قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا دائرہ اُس دائرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "ہونا چاہیئے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ ان کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلے اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقے پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابطِ عمل معین کرتے ہیں۔ اور قانون ان بہت سے مجموعوں میں سے صرف اُن جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لئے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اسی دائرے پر منحصر کردے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیئے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوسائٹی کی اُس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش

کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ قانون اسی اسکیم کا ایک جزو ہے، اور اس جزء کے مزاج کو سمجھنا، یا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کل کو سمجھا جائے۔

نظام زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں ہم "کیا ہونا چاہیئے" کے سوال کا جو جواب دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال یعنی "کیوں ہونا چاہیئے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "کیا ہونا چاہیئے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل اُن نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کئے ہیں، اور ان نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اس ماخذ یا مآخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کُن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے ان نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دُنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے مآخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کے باعث ان کے نظرئے مختلف ہوئے، ان کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر ان سکیموں کے جو حصے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور ان کے مآخذ اور ان سے وجود میں آنے والے پورے نظامِ حیات کو سمجھے بغیر صرف اس کے قانونی حصہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اس قانونی حصہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اُڑتی ہوئی خبریں سُن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظام زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظام زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ ان کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس

بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائیگی، اس لئے میں صرف اسلامی نظامِ زندگی کی تشریح پر اکتفا کرونگا۔

اسلامی نظامِ زندگی کا ماخذ

اسلام جس نظامِ زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف اڈیشن قدیم ترین زمانے سے، توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دُنیا میں شایع ہوتے رہے اور آخری اڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں الکتاب (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اس کے اڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس الکتاب کو لیکر آئے اور جنھوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشا کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں، لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لیکر اُٹھے ان سب کو ایک جامع نام الرسول سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس الکتاب اور الرسول نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں صریحاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقرر قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہان ہست و بود کا ہر حصّہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیّت (Born Subject) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر

کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصہ میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حمل سے لیکر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانون طبعی (Laws of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا ان سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہئیے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہئیے۔

حق کا بنیادی تصور یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اولین بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام چھوٹے سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ الکتاب اور الرسول نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امرِ واقعہ (Fact) کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصہ کا اور اُس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لئے بھی حق ہے کہ انسان جن قوتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے، کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔

اس لئے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کئے جاتے ہیں وہ سب خدا کی ملک ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ جس مملکت میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے۔ اور اس لئے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیات انسانی کی ہمواری (Harmony) کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصوں کا حاکم اور سرچشمۂ احکام ایک ہی ہو۔ ان دو حصوں کے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف قبلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اسلام" اور "مسلم" کے معنی

الکتاب اور الرسول انسان کے سامنے اس حق کو پیش کرتے ہیں اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اس کو قبول کرلے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے انسان کو خود اختیار دیا ہے اس لئے یہ بات کہ انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرائی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اس بیان واقعہ (statement of Fact) پر ہو جائے جو الکتاب اور الرسول نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے کہ اس واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (Surrender) کردے۔ اسی تسلیم کا نام اسلام ہے، اور جو لوگ تسلیم کا یہ فعل کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنھوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اُس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انھوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت

اب ایسے تمام لوگ جنھوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم

ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی اُن سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے۔ اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے Contract کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا اُن کا حاکم ہے، اسی کی ہدایت اُن کے لئے دستورِ زندگی ہے، اسی کے احکام ان کے لئے قانون ہیں، وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائیگا اور اسی کو شر تسلیم کرینگے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح اور غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لینگے، اور اپنی آزادی کو اُن حدود کے اندر محدود رکھینگے جو خدا اُن کے لئے کھینچ دیگا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں "کیا ہونا چاہیئے" کا جواب خود تجویز نہیں کریگی بلکہ اُس جواب کو قبول کریگی جو خُدا کی طرف سے ملیگا۔

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو الکتاب اور الرسول اُسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے، اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اپنے معاملات زندگی کی اُس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی خبط نہ ہوگئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کرسکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ زندگی اختیار کرسکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی "مسلم" کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کرلے کہ شریعت اب اُس کا ضابطۂ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کریگی، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ "مسلم" کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اس کے اصول

ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اس اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو انسانی زندگی کے لئے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اس کے مقصد اور اس کے بڑے بڑے اصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اُس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرتِ انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے۔ اور منکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لئے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ ان بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دئے جائیں۔

اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سد راہ ہو سکتے ہوں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائلِ قیام و ترقی بھی معروف میں شمار ہو جاتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع، یا ظہور، یا نشو و نما کا ذریعہ بنیں یا سائق بنیں

پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے، اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر سے وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اُس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دوسرے مندوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مباح یعنی جائز۔

فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو، یا جن کے معاملہ میں بہ یں صفائی طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے، اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین، ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام، یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی

ناپسندیدہ۔ حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیدیئے گئے ہیں۔ رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتہً یا کنایتہً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سدباب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و فرائض، قیامِ عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظامِ زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور نشوونما دینا ہے، کیا برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادیٔ عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کونسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظامِ شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالم وجود ہے، نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کیے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ ۱/۸ انسان یا ۱/۶ انسان

نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ ان خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور
سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے، نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر
آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائیگی، اور نہ انسانی جسم کے
ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ کو الگ الگ لے کر آپ ان کے حُسن یا ان کے فائدے کے متعلق کوئی رائے
قائم کر سکتے ہیں جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور اُن کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی
حال شریعت کے نقشۂ زندگی کا بھی ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کا۔
اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جداگانہ رائے زنی کرنا درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعہ
سے الگ ہو کر اس کا کوئی جزو وہ کام کر سکتا ہے جو وہ صرف اپنے مجموعہ ہی میں رہ کر کیا کرتا ہے، نہ کسی
دوسرے نظام زندگی میں اس کے کسی جز یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔
شارع نے یہ نقشہ اس لئے بنایا ہے کہ یہ پورا کا پورا ایک ساتھ قائم ہو، نہ اس لئے کہ آپ حسب منشاء
اس کے جس جز کو جب چاہیں لیکر قائم کر دیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔
اس کا ہر جز دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی وہ کام کر سکتا
ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جبکہ پورے نظام
اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ
یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جزء کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر یا تو
اسے موجودہ غیر اسلامی نظام زندگی کے اندر رکھ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے
خود اسی جزو کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اس کے حُسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی
قانون فوجداری کی بعض دفعات پر آج کل لوگ بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن انھیں یہ معلوم
نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر ان کے ساتھ ایک نظام معاشیت،
ایک نظام معاشرت، ایک نظام حکومت، ایک نظام تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پورا کا

اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو۔ تو پھر ان دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اس نقشۂ زندگی کے بھی خلاف ہے۔ بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے، مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لئے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اُس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لئے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظام معاشرت میں سب لوگوں کے لئے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسب معاش کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، جس کے نظام تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لئے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا، جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے، جس میں حاجت مند کے لئے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھتکار اور پھٹکار ہے، جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے، جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خود غرض اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعے سے اُن کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اُس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت پیش نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لئے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے

لوگ خود ہی رضا کارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اس کے لئے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانونِ تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر کس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظام تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظرِ عام پر آنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق کا عام چرچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لئے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سنیما درسِ عشق دے رہے ہیں، نہایت گندا لٹریچر آزادی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، بنی سنوری خواتین کھلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ رواجوں سے نکاح کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادری کا خطاب ملنا چاہیئے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصہ کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا ایک جزء ہے۔ یہ جزء بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کُل سے الگ کر کے اسے سمجھا جا سکے یا جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجراء نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیشِ نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے اور اس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجرا صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے، کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کرا سکتی۔ بعض اور حصے ایسے ہیں جنہیں اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کراتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کے لئے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے اصلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک حصہ، بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لئے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظام زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے ان احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لئے ایک نظام عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی آخری حصہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے، کیونکہ وہ رعیت پر حاکم کا مقرر کیا ہوا مجموعۂ احکام ہے۔ لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کئے جائیں، اس لئے ہم شریعت کے صرف اس حصہ کو "قانونِ اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لئے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلامی قانون کے اہم شعبے

اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے ایک دستوری قانون (Constitutional Law) کی ضرورت ہے، اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوق شہریت ملتے اور کس بنا پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانون اور اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام

کن اصولوں پر چلایا جائیگا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں گے؟ اس کا تقرر کون کریگا، کس کے سامنے وہ جوابدہ ہوگا، اور کن حدود کے اندر وہ کام کریگا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہونگے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہونگے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے۔ پھر ان اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کئے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقرر کئے ہوئے ان اصولوں پر قائم رہیں، لیکن کوئی مفصل دستور ہر زمانے کے لئے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس کے اندر فروعی ردوبدل بھی جائز نہ ہو۔

تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لئے ایک انتظامی قانون (Administrative Law) کی ضرورت ہے، سو اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دیئے ہیں، اور مزید براں اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لئے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی؟ حکومت کے واصلات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لئے حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کونسی بھلائیاں ہیں جنہیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لئے اسے کوشش کرنی چاہئے اور کونسی برائیاں ہیں جنہیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگانِ ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو محض اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم و نسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر ہمیں نہیں دیدیا ہے جسے ایک ہی شکل و صورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری

قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم اُن اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں۔

اس کے بعد اجتماعی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Private Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دور میں اور معاملاتِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دئے ہیں وہ ابد تک ہر ملک اور ہر دور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہو سکتے ہیں (بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو)، اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملات زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جا سکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، ان میں خود شریعت ہی کی رو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل وعقد باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں اور اس طرح جو قوانین بنائے جائیں گے وہ قانون اسلام ہی کا ایک جزء شمار ہونگے، کیونکہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہاء نے استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کئے تھے وہ قانون اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لئے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں، اور جہاں تفصیلات نہیں دیں وہاں ایسے اصول دیدئے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جا سکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری	اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم

قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کونسی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں، اور میّت کے ترکہ میں وارثوں کے حصّے۔

(۲) اصولی احکام جو قرآن اور ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

(۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعداد ازواج کے لئے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لئے تین کی حد، یا وصیت کے لئے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصّہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب وتمدن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل وصورت معین کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب وتمدن کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابل تغیر وتبدل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کچھ قابل ترمیم و تنسیخ ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے، وہ تو ایک پگھلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر

پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوتِ فیصلہ غلطی کر کے "معروف" سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر، یا صریحاً منع کر کے یا اصول بتا کر، یا حد لگا کر گویا نشاناتِ راہ (sign posts) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتارِ ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفرِ زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانونِ ازدواج اور قانونِ میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) تعبیر یا تاویلِ احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہ رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیرات پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلافِ تعبیر پہلے بھی امت کے اہل علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہیگا۔

(۲) قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملتے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

(۳) اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر ان کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

(۴) استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسب ضرورت ایسے توانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد و استحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہرحال اس کا مجاز ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کردے۔ اس کے لئے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اُترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جاسکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا جاسکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیر احکام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دئیے گئے ہیں، ان حالات سے واقف ہو جن میں ابتداً یہ احکام دئیے گئے تھے، قرآن کے انداز بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرے پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے ان کی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملات زندگی کا عمدہ فہم ـــــ محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے فہم ـــــ درکار ہے۔ استحسان کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظام زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو توانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظام زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقا کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں اُن کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس موجود ہو۔ یقیناً یہ کام اُن لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پروا ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر

نگاہ جما چکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدریں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اسلامی قانون کا ارتقا نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تحریف ہی ہو سکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب میں مختصر طور پر اُن اعتراضات سے بحث کرونگا جو پاکستان میں اسلامی قانون کے اجراء کا مطالبہ سُن کر بالعموم کئے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں، اس لئے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی ذرا دل کھول کر کی جاتی ہے۔ لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

تہمتِ بوسیدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پُرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اڑتی خبر سُن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنا لے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام واصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دئے گئے تھے اُن پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقا اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم ونسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء تک اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رُکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی

اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل در آمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا۔ لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کرسکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقاء ہوتا ہے، انھیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحب علم آدمی اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ جس طرح پچھلی ۱۲ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہیگا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہزار قسم کے وسوسوں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر تنگ دامنی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

الزام وحشت دوسرا اعتراض، جو پبلک میں تو دبی زبان سے مگر نجی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جسارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرون وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنھیں اس مہذب دور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور درّے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔

یہ اعتراض سن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

جس دور میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہئیے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک سے تاریک دور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار

نہیں بم مار کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں کاٹتا، جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ دمّے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مُردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامۂ غیظ و غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو وہ سیاسی مجرم، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کونسی کسر اُٹھا رکھتا ہے؟ ثبوت جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبال جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی مہذب حکومتوں میں اختیار کئے جا رہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ اِن ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں اُن پر وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بیخودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو درکنار، سرزنش اور ملامت بھی انھیں ناگوار ہوتی ہے۔ اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ وہ ناگوارِ خاطر ہونی ہی چاہیئے۔

اب میں اِن معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ تہذیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کئے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لئے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں۔ آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنائیے، کوئی اور نام اپنے لئے تجویز کیجئے، اور صاف صاف یوں کہیئے کہ ہم اسلام کو بحیثیت ایک دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں، اس پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے،

اور کون احمق یہ باور کر سکتا ہے کہ اس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد آپ اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔

فقہی اختلافات کا بہانہ تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جدا ہے، اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا؟

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے "خطرے" کو ٹال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائے گا۔ حالانکہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں، اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ، جو خدا اور رسول کے مقرر کئے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتدا سے آج تک یکساں مسلّم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیراتِ احکام میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۂ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اسی وقت بنتا ہے جبکہ اس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہا جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ الاجماع یا علیہ الجمہور اور علیہ الفتویٰ، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے

کی بنا پر اب یہ قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے، یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے، دوسرے وہ جن پر کسی وقت کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انھیں قبول کر لے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظرثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں تمام مسلمانوں کو بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں، تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں (اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں)، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائینگے۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے پیش آنے والے معاملات میں حکم خدا اور رسول کی جس تعبیر، یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اہل حل وعقد کا اجماع ہو جائیگا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کریگی وہ ہمارے ملک کے لئے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاویٰ پر مشتمل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلم ہوتے تھے، اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابل عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کونسی صورت تجویز کی جاسکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرسنل لا کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے، لیکن قانون ملکی (Law of the Land) بہرحال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں لہٰذا یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے۔ اسلام پر اختلاف کرکے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پسند افراد کو چاہیے

کتنی ہی پسند ہو، بہرحال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے۔ غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ وہ کس طرح یہ گوارا کریں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط ہو جائے؟

یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر محض ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لئے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانون ملکی ہے نہ کہ قانون شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مسلم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمۃ کو دیا تھا، بلکہ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہل قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذاہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیئے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانونِ ملکی کونسا ہو؟ انصاف کی رو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانون ملکی وہی ہونا چاہیئے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لئے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق

نہیں سمجھتے۔ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے، ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مرتد ہو رہے ہیں۔ کیا فی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کریں؟ کیا کوئی اقلیت کسی با اختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لامذہب ہی ہو کر رہنا چاہیئے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

روزہ اور ضبطِ نفس

(یہ تقریر چار جنوری ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

روزے کے بے شمار اخلاقی و روحانی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان میں ضبطِ نفس کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم ضبطِ نفس کا مطلب سمجھ لیں، پھر یہ معلوم کریں کہ اسلام کس قسم کا ضبطِ نفس چاہتا ہے، اور اس کے بعد یہ دیکھیں کہ روزہ کس طرح یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو یافتہ ہو اور نفس کی خواہشات و جذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہیں۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمران کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضاء خودی کے آلۂ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لئے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لئے کس طرح استعمال کرے اور نفس کی گذارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کرے۔ اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں وہ اپنا حکم اپنے منشا کے مطابق نہ چلا سکے، اور اس کے لئے نفس کی خواہشیں، مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہوں تو وہ ایک مغلوب اور بے بس خودی ہے، اس کی مثال اس سوار کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کے بس میں آ گیا ہو۔ ایسے کمزور انسان دنیا میں کسی قسم کی بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تاریخِ انسانی میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو بزور اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے، جو خواہشاتِ نفس کے بندے اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ ان کے آقا بن کر رہے ہیں، جن کے ارادے مضبوط اور عزم پختہ رہے ہیں۔

لیکن فرق اور بہت فرق ہے اس خودی میں جو خود خُدا بن جائے، اور اس خودی میں جو خدا کی تابع فرمان بن کر کام کرے۔ کامیاب زندگی کے لئے خودی کا قابو یافتہ ہونا تو بہرحال ضروری ہے، مگر جو خودی اپنے خالق سے آزاد اور دنیا کے مالک سے بے نیاز ہو، جو کسی بالاتر اخلاقی قانون کی پابند نہ ہو، جس کو کسی حساب لینے والے کی بازپرس کا اندیشہ نہ ہو، وہ اگر اپنے جسم و نفس کی طاقتوں پر قابو پاکر ایک زبردست خودی بن جائے تو وہ دنیا میں فرعون اور نمرود، ہٹلر اور مسولینی جیسے بڑے بڑے مفسد ہی پیدا کر سکتی ہے۔ ایسا ضبط نفس نہ قابل تعریف ہے اور نہ وہ اسلام کو مطلوب ہے۔ اسلام جس ضبط نفس کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی خودی اپنے خُدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے، اس کی رضا کی طالب اور اس کے قانون کی اطاعت کو اپنا شعار بنالے، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھ لے، پھر اس مسلم و مومن خودی کو اپنے جسم اور اسکی طاقتوں پر حاکمانہ اقتدار، اور اپنے نفس اور اس کی خواہشوں پر قاہرانہ تسلط حاصل ہو، تاکہ وہ دنیا میں ایک مصلح قوت بن سکے۔

یہ ہے اسلامی نقطۂ نظر سے ضبط نفس کی اصل حقیقت۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح انسان میں یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ نفس و جسم کے مطالبات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ طاقت ور مطالبے ہیں۔ ایک غذا کا مطالبہ جس پر بقائے حیات کا انحصار ہے۔ دوسرا صنفی مطالبہ جو بقائے نوع کا ذریعہ ہے۔ تیسرا آرام کا مطالبہ جو قوت کارکردگی کی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ یہ تینوں مطالبے اگر اپنی حد کے اندر رہیں تو عین منشائے فطرت ہیں۔ لیکن نفس و جسم کے پاس یہی تین پھندے ایسے ہیں کہ ذرا سی ڈھیل پاتے ہی وہ ان کے جال میں پھانس کر آدمی کی خودی کو الٹا اپنا غلام بنالیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مطالبہ بڑھ کر مطالبات کی ایک فہرست بن جاتا ہے اور ہر ایک زور لگاتا ہے کہ انسان اپنا مقصد زندگی، اپنے اصول اور اپنے ضمیر کے فتوے بھول کر بس اسی کے تقاضے پورے کرنے میں لگا رہے

ایک کمزور خودی جب ان تقاضوں سے مغلوب ہو جاتی ہے تو غذا کا مطالبہ اسے بندۂ شکم بنا دیتا ہے، صنفی جذبہ اس کو حیوانیت کے اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے، اور جسم کی آرام طلبی اس کے اندر ارادے کی کوئی طاقت باقی نہیں رہنے دیتی۔ پھر وہ اپنے نفس و جسم کی حاکم نہیں بلکہ ان کی محکوم بن کر رہتی ہے اور اس کا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے احکام کو بھلے اور بُرے، جائز اور ناجائز، تمام طریقوں سے بجا لایا کرے۔

روزہ نفس کی انہی تین خواہشوں کو اپنے ضابطے کی گرفت میں لیتا ہے اور خودی کو ان پر قابو پانے کی مشق کراتا ہے۔ وہ اس خودی کو جو غذا پر ایمان لا چکی ہے، یہ خبر دیتا ہے کہ تیرے خدا نے آج دن بھر کے لئے تجھ پر دانہ پانی حرام کر دیا ہے۔ اس مدت کے اندر تیرے لئے پاک غذا اور جائز کمائی سے حاصل کی ہوئی غذا بھی جائز نہیں ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے مالک نے آج تیری صنفی خواہشات پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ صبح صادق سے غروب آفتاب تک تیرے لئے حلال طریقے سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنا حرام ہے۔ وہ اسے یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ تیرے رب کی خوشی اسی میں ہے کہ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد جب تو افطار کرے تو نڈھال ہو کر لیٹ نہ جا بلکہ اُٹھ کر عام دنوں سے زیادہ اس کی عبادت کر۔ وہ اس کو یہ حکم بھی پہنچاتا ہے کہ نماز کی لمبی رکعتوں سے فارغ ہو کر جب تو آرام لے تو صبح تک مدہوش ہو کر نہ پڑ جا بلکہ معمول کے خلاف سحری کے لئے اُٹھ اور صبح سے پہلے اپنے جسم کو غذا دے۔ یہ سارے احکام پہنچا دینے کے بعد وہ ان کی تعمیل کا معاملہ خود اُسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی پولیس، کوئی سی آئی ڈی، کوئی خارجی دباؤ ڈالنے والی طاقت نہیں لگائی جاتی۔ وہ چھپ کر کھائے پیئے یا صنفی خواہشات پوری کر لے تو خدا کے سوا کوئی اُسے دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ تراویح سے بچنے کے لئے کوئی شرعی حیلہ کر دے تو کوئی دنیوی طاقت اس پر گرفت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اس کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ اگر مومن کی خودی واقعی خُدا کی مطیع ہو چکی ہے اور اگر اس کے ارادے میں اتنا زور ہے کہ نفس پر قابو پا سکے تو وہ خود ہی غذا کی مانگ کو، صنفی خواہش کو اور آرام کی طلب کو اس ضابطہ میں کس دے گا جو آج خلاف معمول

اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہ صرف ایک دن کی مشق نہیں ہے۔ ایسی مشق کے لئے ایک دن کافی بھی نہیں ہو سکتا۔ مسلسل ۳۰ دن خودی سے یہی مشق کرائی جاتی ہے۔ سال بھر میں ایک بار پورے ۷۲۰ گھنٹے کے لئے یہ پروگرام بنا دیا گیا ہے کہ رات کے آخری حصے میں اُٹھ کر سحری کھاؤ، صبح کی پو پھٹتے ہی کھانا پینا بند کر دو، دن بھر ہر قسم کی غذا سے پرہیز کرو، غروب آفتاب کے بعد ٹھیک وقت پر افطار کرو، پھر رات کا ایک حصہ تراویح کی غیر معمولی نماز میں کھڑے رہ کر گزار دو، اور چند گھنٹے آرام لینے کے بعد پھر دوسرے دن کے لئے یہی پروگرام شروع کر دو۔ اس طرح مہینہ بھر تک پے در پے نفس کے ان تین سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور مطالبوں کو ضابطے میں کستے رہنے سے خودی کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق اپنے نفس و جسم پر حکومت کر سکے۔ اور یہ عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ کا پروگرام نہیں ہے بلکہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد سے مرتے دم تک ہر سال میں ایک مہینہ اسی مشق کے لئے وقف کیا گیا ہے تاکہ نفس پر خودی کی گرفت بار بار تازہ اور سخت ہوتی رہے۔

یہ ساری مشق محض اس غرض کے لئے نہیں ہے کہ مومن کی خودی صرف اپنی بھوک، پیاس شہوت اور آرام طلبی پر قابو پا لے۔ اور اس کی غرض یہ بھی نہیں ہے کہ اس کو نفس و جسم پر یہ قابو صرف ایک رمضان ہی کے مہینے میں حاصل رہے۔ دراصل اس کا مدعا یہ ہے کہ نفس کے ان تین سب سے زیادہ زور دار حربوں کا مقابلہ کر کے وہ اس کے سارے ہی جذبات اور ساری ہی خواہشات پر قابو یافتہ ہو جائے۔ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ محض رمضان ہی میں نہیں بلکہ رمضان کے بعد بھی باقی گیارہ مہینوں میں وہ ہر اس خدمت کے لئے اپنے جسم اور اس کی طاقتوں سے کام لے سکے جو خدا نے اس پر فرض کی ہو، ہر اس بھلائی کے لئے کوشش کر سکے جس میں خدا کی رضا ہو، ہر اس برائی سے رک سکے جو خدا کو ناپسند ہو، اور اپنی خواہشات و جذبات کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھ سکے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔ اس کی باگیں نفس کے قبضہ میں نہ ہوں کہ جدھر جدھر وہ چاہے

اسے کھینچے کھینچے لئے پھرے بلکہ عنان اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نفس کی جن خواہشوں کو جس وقت، جس حد تک اور جس طرح پورا کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے انھیں اسی ضابطہ کے مطابق پورا کرے۔ اس کا ارادہ اتنا کمزور نہ ہو کہ فرض کو فرض جانتا بھی ہو، ادا بھی کرنا چاہتا ہو، مگر جسم پر اس کا حکم ہی نہ چلتا ہو۔ نہیں، جسم کی مملکت میں وہ اس زبردست حاکم کی طرح رہے جو اپنے ماتحت عملہ سے ہر وقت اپنے حسب منشا کام لے سکتا ہو۔ یہی طاقت پیدا کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ جس شخص نے روزہ سے یہ طاقت حاصل نہ کی اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھوک پیاس اور رت جگے کی تکلیف دی۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اس بات کو صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ روزے تم پر اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اس کا پانی اور کھانا چھڑا دینے کی خدا کو کوئی حاجت نہیں۔ نیز حضور نے فرمایا بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جو روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔

(باجازت ریڈیو پاکستان)
